تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

اسرار احمد

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد



یکے از مطبوعاتِ تنظیمِ اسلامی

تنظیمِ اسلامی

مرکز تنظیم اسلامی' 67۔ اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

فون:6316638-6366638 فیکس:6305110

ای میل markaz@tanzeem.org ویب سائٹ:www.tanzeem.org

نام کتاب ——— تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ
تاریخ اشاعت (جولائی 2008ء) ——— 1100
ناشر ——— تنظیم اسلامی پاکستان
مطبع ——— آئیڈیل پرنٹنگ پریس' لاہور
مقامِ اشاعت ——— 67۔اے' علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فہرست

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۶۶ء میں میرے ذاتی اشاعتی ادارے "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت شائع ہوا تھا۔ کئی سال سے یہ بالکل نایاب تھی۔ لگ بھگ سترہ سال بعد اس کا یہ دوسرا ایڈیشن "مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی" کے زیر اہتمام پیش خدمت ہے۔

ان سترہ سالوں کے دوران یقیناً بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا ہے اور حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض شخصیتیں اور جماعتیں تو ماضی کے دھندلکوں میں بالکل ہی گم ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں ان میں سے بھی بہتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ؎

"کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!"

تاہم اس کتاب کا موضوع تا حال زندہ ہے۔ اس لیے کہ یہ برّ صغیر پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی جس اہم دینی تحریک کے "تحقیقی مطالعہ" پر مشتمل ہے اس کے کم از کم قدیم نام کے تسلسل کے ساتھ ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعت پاکستان میں اور ایک نیم مذہبی اور نیم سماجی جماعت ہندوستان میں موجود ہے اور یہ سوال دین اور تاریخ دونوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے کہ تقریباً نصف صدی پیشتر شروع ہونے والی اس اسلامی تحریک کے ساتھ جس کا ابتدائی انداز بڑا "انقلابی" تھا، کیا حادثہ پیش آیا کہ بظاہر ایک مضبوط تنظیم اور لاتعداد مخلص کارکنوں کی مخلصانہ مساعی کے باوجود وہ روز بروز منزل سے دور سے دور تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ محض ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر لے؟ —

آیا اس کا آغاز ہی غلط تھا اور صورت وہ تھی کہ ع

"مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!"

یا یہ بعد میں کوئی غلط موڑ مڑ گئی؟ ـــ اگر پہلی بات ہے تو تشخیص ہونی چاہیے کہ ابتدائی نظریات و تصورات میں کیا کجی یا خامی تھی اور اگر دوسری بات ہے تو تعیین ہونی چاہیے کہ وہ غلط موڑ کس مرحلے پر مڑا گیا!

کسی دوسرے شخص کے لیے یہ معاملہ محض علمی دلچسپی کا بھی ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس کی اہمیت واقعی اور عملی ہے، اس لیے کہ میں نے نہ کبھی پہلے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس کی' نہ آج کوئی عار محسوس کرتا ہوں کہ میرے قلب و ذہن پر اس تحریک نے نہایت گہرے اور لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ چنانچہ میں نے نہ صرف یہ کہ اپنی جوانی کے دس سال اس تحریک کے ساتھ بھرپور وابستگی کی نذر کیے تھے' بقول شاعر ؎

یہ اور بات کہ تم پر نثار کر دی ہے عزیز اپنی جوانی کسے نہیں ہوتی!!

بلکہ اس تنظیمی تعلق کے انقطاع پر رُبع صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود تاحال صورت یہ ہے کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی!

چنانچہ اس وقت راقم جو کچھ کر رہا ہے اور جس دعوت کو لے کر کھڑا ہوا ہے اس کے ذہنی و فکری پس منظر کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے رفقاء واحباب' ناقدین و مبصّرین اور مخالفین و معاندین سب کے لیے اس تحریک کے بارے میں اس کی رائے کو جاننا اور سمجھنا لازمی ولابدی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے پیش کردہ تصورِ دین و مطالباتِ دین پر ایک نہایت اہم اور اساسی اور نہایت مدلّل اور زوردار تنقید جماعت اسلامی ہند

سے علیحدہ ہونے والی ایک معروف شخصیت جناب وحید الدین خاں (حال مدیر "الرسالہ" دہلی) کی تالیف "تعبیر کی غلطی" کی صورت میں پیش نظر کتاب کے طبع اول کے تقریباً ساتھ ہی منصۂ شہود پر آئی تھی اور ایک نسبتاً نرم تنقید تقریباً تین سال قبل مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ کی تالیف "عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کی صورت میں سامنے آئی ہے — ان سطور کے راقم نے بھی اس موضوع پر اپنے ایک کتابچے "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میں "تعبیر کی کوتاہی" کے عنوان سے اظہارِ رائے کیا ہے۔

لیکن پیش نظر کتاب کے بارے میں یہ واضح رہنا چاہئے کہ اس کا اصل موضوع یہ نہیں ہے بلکہ اس میں "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کا امکانی حد تک معروضی مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے کہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں اس تحریک کے آغاز کے وقت اس کے اصول و مبادی کیا تھے اور پھر ۱۹۴۷ء میں اس کا جزوِ اعظم یعنی جماعت اسلامی پاکستان کیا غلط موڑ مڑ گئی جس کے باعث وہ پاکستانی سیاست کی بھول بھلیوں میں اس طرح گم ہو کر رہ گئی کہ اس کے قدیم متوسلین کی عظیم اکثریت حیران و پریشان ہے کہ ؎

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں؟

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو تحریکِ جماعتِ اسلامی کے دورِ اول کے بارے میں جو رائے اس کتاب میں ظاہر ہوئی ہے اور بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکوں کے تصورِ دین کے ضمن میں جو رائے "تعبیر کی کوتاہی" کے عنوان سے "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" میں سامنے آئی ہے، ان میں کچھ فرق و تفاوت بلکہ تضاد نظر آئے — اس لیے یہ وضاحت بے محل نہ ہو گی کہ دین کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور خارجی اور دوسرا داخلی و باطنی — مقدم الذکر کی جامع تعبیر "اسلام" ہے اور مؤخر الذکر کا جامع عنوان "ایمان" — اسلام کا آغاز "اِقرارٌ بِاللِّسان" یعنی کلمۂ شہادت سے ہوتا ہے اور اس کی اساس پر اولاً عبادات و معاملات کے ایک مکمل نظام کی وسیع و عریض عمارت

وجود میں آتی ہے اور پھر شہادت علی الناس اور اقامت و اظہارِ دینِ حق کی بالائی منزلیں تعمیر ہوتی ہیں جن کے لیے دعوت و حرکت اور سعی و جہد کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ" ــــ دوسری طرف ایمان کا نقطۂ آغاز "تَصدیقٌ بِالقَلب" ہے اور اس کی جڑیں انسان کے باطن کی گہرائیوں میں اترتی ہیں تو تدریجاً علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور نتیجۃً صبر و توکّل، تسلیم و رضا، تضرع و اِخبات، تفویض الامر الی اللہ اور محبتِ الٰہی کے سوز و گداز کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ــــ مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف میں جہاں تک دین کے مقدم الذکر پہلو کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے وہ میری رائے میں نہایت جامع بھی ہے اور بحیثیتِ مجموعی صحیح اور درست بھی، اور اسی کا مظہر ہے تحریکِ جماعتِ اسلامی کا دورِ اول اور اس کے اصول و مبادی، البتہ جہاں تک مؤخر الذکر پہلو کا تعلق ہے اس کے ضمن میں افسوسناک حد تک کمی اور کوتاہی پائی جاتی ہے، جس کے باعث یہ تحریک مجموعی مزاج اور عمومی نتائج کے اعتبار سے "دینی" سے زیادہ "دنیوی" بن کر رہ گئی ــــ اور راقم کے نزدیک اب دعوتِ دین اور حرکتِ اسلامی کے میدان میں "کرنے کا اصل کام" یہ ہے کہ دین کے خارجی تصورات اور تقاضوں کی جامعیت اور ہمہ گیریت کو برقرار رکھتے ہوئے اس داخلی و باطنی عنصر کی کمی کی تلافی کی کوشش کی جائے، نہ یہ کہ توجہات کو باطنی پہلوؤں پر اس طور سے مرتکز کر دیا جائے کہ دین اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں کا تصور محدود ہو کر دنیا کے مروجہ مذہبی تصورات کی شکل اختیار کر لے!! اور اس طرح افراط کی جگہ تفریط کی صورت پیدا ہو جائے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِن ذٰلِکَ!!

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بغیر کسی تبدیلی کے بالکل جوں کا توں پیش کیا جا رہا ہے۔ صرف ایک مقام پر ایک لفظی تبدیلی کی گئی ہے اور وہ ہے صفحہ نمبر ۲۱۲ کی سطر نمبر ۱۱ میں جہاں قوسین میں پہلے ایڈیشن کے "حبِّ عاجلہ" کو "عجلت پسندی" سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ ایک تسامح تھا جس کی جانب ماہنامہ "زندگی" (رامپور بھارت) کے مدیر

جناب عروج قادری نے توجہ دلائی تھی جس کے لیے راقم ان کا ممنون ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ طبع اول (ص۱۲ تا ۳۰) آج سے سترہ سال قبل کا تحریر شدہ ہے اور بقیہ پوری کتاب اس بیان پر مشتمل ہے جو اس سے بھی دس سال قبل ۱۹۵۶ء میں ضبطِ تحریر میں آیا تھا جب کہ میری عمر کل چوبیس برس تھی — زبان و ادب کے میدان کا شہسوار ہونے کا تو راقم اب بھی مدعی نہیں ہے تاہم اُس وقت تو بالکل گھٹنوں چلنے والی بات تھی۔ چنانچہ لغت اور انشاء دونوں کی بے شمار غلطیاں اس میں موجود ہیں' بایں ہمہ چونکہ اب اس تحریر کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے لہٰذا اس میں کوئی اصلاح نہیں کی گئی۔

آخر میں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب کے صفحات ۱۸۵ تا ۱۹۰ میں ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت کے ضمن میں جو بحث آئی ہے' اس میں ایک تو اصلاً قادیانی مسئلے میں جماعت اسلامی پاکستان کا اُس وقت کا طرز عمل زیر بحث آیا ہے' نہ کہ اصل مسئلہ قادیانیت اور دوسرے اس سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید راقم کے نزدیک لاہوری احمدی' دائرۂ ملّتِ اسلامی سے خارج نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کو اگر پہلے کچھ تردّد تھا بھی تو ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختم نبوت اور اس کے دوران سامنے آنے والے حقائق کے بعد وہ بالکل رفع ہو چکا ہے۔

میرے نزدیک اس امر میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آنجہانی غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد ایسے کسی بھی شخص کو نبی یا مجدّد ماننے والا تو درکنار' محض مسلمان ماننے والا شخص بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

تحریر ۳۱/ جنوری ۱۹۸۳ء

دیباچہ طبع اول

پیش نظر تحریر دراصل ایک بیان ہے جو بحیثیتِ رکنِ جماعت اسلامی راقم الحروف نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے اس کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر جو کراچی میں نومبر ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوا تھا' ایک اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ کا منعقد ہوا جس کے سامنے وہ بہت سے اعتراضات اور متبادل تجاویز و مشورے پیش کیے گئے جو جماعت کی پالیسی اور نظام سے متعلق جماعت کے اراکین کی جانب سے موصول ہوئے تھے اور جن پر معترضین اور مجوزین حضرات اجتماعِ ارکان میں بحث کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی مجلس شوریٰ نے اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر طریق کار اور دستور سے متعلق ان دقیق بحثوں کو ارکان کے اجتماع میں چھیڑنے کی اجازت دے دی گئی تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا' یہ فیصلہ کیا کہ ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے کہ جن میں نظمِ جماعت اور اس کے دستور میں بحث کی گئی تھی ایک مجلسِ تدوینِ دستور کا انتخاب عمل میں لایا جائے جس میں جماعت کے تمام تنظیمی حلقوں کو تعدادِ ارکان کے تناسب سے نمائندگی دی جائے [1] تاکہ یہ مجلس جماعت کے لیے ایک نیا دستور مدون کرے اور ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے جو جماعت کے طریق کار اور پالیسی سے متعلق ہیں ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی جائے جس کے سپرد یہ خدمت ہو کہ وہ تمام پاکستان کا دورہ کر کے جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ لے' اور ارکانِ جماعت سے فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے ان کی بے چینی کے اسباب معلوم کرے

---

[1] اس مجلس میں حلقہ اوکاڑہ کے دو نمائندوں میں ایک راقم الحروف بھی منتخب ہوا تھا۔

اور جو تجاویز ان کے ذہنوں میں ہوں ان کو مرتب کر کے ایک جامع رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرے۔

یہ مجلس ابتداءً آٹھ ارکان پر مشتمل تھی، لیکن چند ماہ بعد بعض وجوہات کی بنا پر اس کو مختصر کر دیا گیا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی سرکردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبدالجبار غازی صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور جناب شیخ سلطان احمد صاحب [1] پر مشتمل اس "جائزہ کمیٹی" نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصے میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائضِ مفوضہ [2] کو ادا کیا اور نومبر ۱۹۵۶ء میں ایک رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہی وہ جائزہ کمیٹی تھی جس کی خدمت میں پیش نظر بیان پیش کیا گیا۔

آج سے تقریباً دس سال قبل کی ایک تحریر کو اشاعتِ عام کے لیے پیش کرتے

---

[1] یہ خیال رہے کہ یہی وہ تین حضرات ہیں جن پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی غیر موجودگی میں وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔

[2] مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۵/ تا ۱۸/ مارچ ۵۶ء نے جائزہ کمیٹی کے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی تھی:

(۱) جماعت کی پالیسی، نظم اور حالات کے متعلق جو اعتراضات، شکایات اور تجاویز سالانہ اجتماع کے موقع پر موصول ہوئی تھیں، ان کے بھیجنے والوں سے گفتگو کر کے یہ تحقیق کریں کہ ان شکایات کی بنیاد کیا ہے اور وہ اصلاح کے لئے ایجابی صورت میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔

(۲) جماعت کے ارکان میں اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی پالیسی، طریق کار اور حالات کے بارے میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں، تو ان سے تحقیق کریں کہ وہ کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔

ہوئے اس سوال کا جواب فطری طور پر میرے ذمے ہے کہ آج تک میں نے اس کو کیوں شائع نہ کیا اور اب کیوں کر رہا ہوں؟

اب سے پہلے اس تحریر کو شائع نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ یہ تحریر برّصغیر پاک و ہند کی ایک معروف دینی و سیاسی جماعت کے بارے میں ایک تاریخی مطالعہ ہونے کے اعتبار سے عمومی دلچسپی کی حامل بھی ہے لیکن اس کے اصل مخاطب جماعت اسلامی کے متعلقین ہی ہیں۔ اور جماعت کے حلقے میں متذکرہ بالا جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے فوراً بعد جو ہنگامی صورت حال [1] پیدا ہوئی' جس کے نتیجے میں نہ

---

[1] اس "ہنگامی صورت حال" کی مختصر تشریح کے لئے میں اپنی رکنیت جماعت سے استعفاء کے حسب ذیل الفاظ نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں :

"جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا' شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا' بہت رد و قدح کے بعد اور بالآخر خوف انتشار کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرار داد کا پاس ہونا' پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف رد عمل' اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں' اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار' سعید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت کی طرف سے تعاقب' امیر جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجویٰ' گروہ بندی اور "غیر شعوری" سازش کا الزام' مولانا امین احسن صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت' امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفاء از امارت جماعت' جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قرار دادہائے اعتماد' دو

صرف پوری جائزہ کمیٹی بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی اور کم و بیش پچاس ساٹھ ارکانِ جماعت، جماعت سے علیحدہ ہوئے اور پھر الزامات اور ان کے جوابات کا جو تلخ سلسلہ شروع ہوا اس نے جماعت کی اندرونی اور اس کے قریب کی فضا کو اس درجہ مکدر کر دیا تھا کہ اس میں اس بات کا سرے سے کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی بھی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے۔ یہ سلسلہ پورے شدّ و مد کے ساتھ مسلسل کئی سال جاری رہا اور اس کے نتیجے میں جماعت سے متعلق اور اس سے ولی ہمدردی رکھنے والے حضرات کے ذہنوں میں جماعتی عصبیت اس درجہ راسخ ہو گئی کہ ان کے قلوب و اذہان نے جماعت سے نکلے ہوئے تو کجا جماعت سے باہر کے کسی بھی شخص کی بات سن کر اس پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس معاملے میں سارا الزام میں جماعت کے متعلقین ہی کو نہیں دیتا، واقعہ یہ ہے کہ ان کی ایک غالب اکثریت کے سامنے نہ صرف یہ کہ اختلاف کی صحیح نوعیت اپنی اصل صورت میں کبھی نہیں آئی بلکہ اہلِ اختلاف نے اظہارِ اختلاف کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی بھی جو صورت ان کے سامنے آئی وہ بظاہر بہت بھونڈی اور ناقابلِ فہم تھی۔ نتیجتہً جماعتی عصبیت کی وہ کچی دیوار جو فطری طور پر پہلے بھی دلوں موجود تھی تعصب کی ایک پختہ فصیل میں تبدیل ہو گئی۔

ارا کین مرکزی شوریٰ کی رکنیت جماعت کا تعطل، مولانا عبدالجبار غازی صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت، مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصب جماعت، سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیت شوریٰ --- یہ سارے معاملات میرے لئے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں، لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں اتنی پست رائے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی۔۔۔۔"

ان حالات میں اس تحریر کی اشاعت سے کسی مثبت اور تعمیری فائدے کے حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور اس کے شائع کرنے سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوتا کہ اس کے مصنف کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور اس کی بھڑاس نکل جاتی، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے اس بندۂ ضعیف پر جس کا شکر وہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا کہ محض یہ منفی محرک اسے اس کی اشاعت پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس دس سال کے عرصے میں راقم الحروف نے اپنی اس تحریر کو متعدد بار از اول تا آخر پڑھا جس سے اس کی صحت پر اس کا یقین مزید پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کئی بار دل میں اس کی اشاعت کا خیال بھی پیدا ہوا لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس سے کوئی تعمیری اور مثبت فائدہ نظر نہ آیا' اس کی اشاعت کو ملتوی کیا جاتا رہا۔

ادھر دو تین سال سے فضا قدرے پر سکون ہوئی ہے اور غیظ و غضب کی وہ آگ ذرا ٹھنڈی ہوئی ہے جو تلخ الزامات اور ان کے تلخ تر جوابات سے دلوں میں بھڑکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکلنے والے" اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں اور "رہنے والے" اپنے مسائل میں مشغول' اور اگرچہ اب بھی طنز و تعریض کے اِکاد کا تیر چلتے رہتے ہیں اور خاص طور پر جب کوئی رکنِ جماعت اور خصوصاً اس کا کوئی اہم رکن کسی سبب سے جماعت اسلامی کو خیرباد کہتا ہے تو نکلنے والوں کے حلقے میں خواہی نخواہی ویسی ہی خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے جیسی کرکٹ کے کسی میچ میں مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کے آؤٹ ہونے سے ہوتی ہے اور اس کے ردِّ عمل کے طور پر اہل جماعت بھی "خوارج" کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ تاہم یہ سب کچھ اب "الشاذ کالمَعدوم" کے حکم میں ہے' ورنہ عام طور پر فضا میں وہ تکدّر باقی نہیں رہا جو کبھی تھا اور نتیجۃً اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ جماعت سے متعلق حضرات میری اس تحریر کو کسی قدر کھلے دل سے پڑھ سکیں گے ـــــ اسی امید پر میں اب اس تحریر کو اشاعتِ عام کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

اس تحریر کا اولین حصہ جسے اب میں نے "مقدمہ" کا عنوان دیا ہے کچھ اس بیان کی "شانِ نزول" سے متعلق ہے اور کچھ اس کے مصنف کے ذاتی حالات و کوائف پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا جزو تو ویسے ہی اس تحریر کے اصل پس منظر کو جاننے کے لیے ضروری ہے — البتہ دوسرے حصے کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل مضمون سے غیر متعلق ہے اور یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے اصل مقصود "نمائشِ ذات" ہے۔ لیکن میرے نزدیک چونکہ "کچھ اپنے بارے میں" کے لکھنے سے جو غرض اس کی تحریر کے وقت پیش نظر تھی وہ آج بھی جوں کی توں موجود ہے' لہٰذا ان تمام امکانات کے باوجود اور اس کے علی الرغم کہ میں خود اس میں ایک فطری سا حجاب محسوس کرتا ہوں' اس کو شاملِ اشاعت کر رہا ہوں۔ اس حصے کی تحریر سے جو غرض یا اغراض میرے پیش نظر تھیں' ان کی وضاحت میں نے تفصیل سے اصل تحریر میں کر دی ہے۔

"تحریکِ جماعتِ اسلامی کا دورِ اول اور اس کے بنیادی افکار و نظریات" اور "دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات" اس تحریر کا اصل موضوع ہیں۔ اس ضمن میں یہ تصریح ضروری ہے کہ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" اور "مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی" دو مختلف موضوعات ہیں۔ مؤخر الذکر موضوع پر پروفیسر محمد سرور صاحب کی ایک تصنیف اس سے پہلے موجود ہے' اور خواہ اس سے کُلی یا جزوی اتفاق یا اختلاف کیا جائے' بہرحال اس کتاب میں اپنے عنوان سے مناسبت رکھنے والا مواد ایک خاص نقطۂ نظر سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس میری اس تحریر کا موضوع "تحریکِ جماعتِ اسلامی" ہے اور اسی کے دو ادوار سے اس میں بحث کی گئی ہے۔

اس معاملے میں خلطِ مبحث خود مولانا مودودی صاحب کا پیدا کردہ ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "جماعت اسلامی' اس کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل" کی ابتداء ان

ﷺ برصفحہ ۴۵ - ۴۶

الفاظ سے فرمائی ہے:

"جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے وہ پچھلے اٹھارہ سالوں میں دو مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب تیسرا مرحلہ شروع ہے۔ پہلا مرحلہ خالص تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کا تھا جس کا سلسلہ تقریباً نو سال جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ تنظیم و تربیت کا تھا اور اس میں تقریباً چھ سال صرف ہوئے۔ اب تیسرا مرحلہ توسیع و عملی اقدام کا ہے جسے شروع ہوئے تین سال ہو چکے ہیں"۔

یہ تحریر اکتوبر ۱۹۵۴ء کی ہے۔ اس حساب سے مولانا مودودی صاحب کے نزدیک "جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے" اس کی ابتداء ۳۴ - ۱۹۳۳ء سے ہوتی ہے، یعنی جب کہ مولانا نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری فرمایا تھا ـــــ

اس کے پانچ سال بعد جب ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی صاحب نے ایک مرتبہ پھر جماعت اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان فرمائی تو متذکرہ بالا مرحلۂ اول کو مزید تین ادوار میں تقسیم کیا اور اس کے دورِ اول کی ابتداء ۱۹۲۸ء سے کی، یعنی جب سے مولانا موصوف نے "لکھنا" شروع کیا۔

میرے نزدیک یہ بات بالبداہت غلط ہے، مولانا مودودی صاحب کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء کے مختلف منازل اور اس سفر کے دوران لیے گئے موڑوں (Turns) کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے ابتداء جہاں سے چاہیں کریں۔ لیکن جماعت اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ابتداء اس طرز پر کرنا صرف اس صورت میں درست ہو سکتا تھا کہ "جماعت اسلامی" کچھ لوگوں کے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر "بیعت" کرنے سے معرضِ وجود میں آئی ہوتی۔ اس صورت میں کسی دستور کا مرتب ہونا اور امیرِ جماعت کا منتخب کیا جانا بے معنی ہوتا۔

میرے نزدیک جماعت اسلامی کے قیام سے قبل مولانا مودودی صاحب نے جو کام کیا، وہ دو طرح کا ہے:

ایکٹ خالص علمی و تحقیقی کام جس کے نتیجے میں مولانا کے ذہن میں دین کا ایک خاص تصور اور اس کے تقاضوں اور مطالبات کا ایک خاص نقشہ تیار ہوا جس کو مولانا نے اپنی تصانیف اور تالیفات میں مفصّل و مدلّل پیش کیا۔ اپنے کام کے اس میدان میں مولانا مودودی صاحب کی حیثیت ایک متکلمِ اسلام کی ہے اور قطع نظر اس سے کہ ان کے پیدا کردہ "جدید علمِ کلام" میں خطا و صواب کا تناسب کیا ہے' بہرحال متکلمینِ اسلام کی صفوں میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

دوسرا مسلمانانِ ہند کے قومی و سیاسی مسائل میں مولانا کی آراء اور ان کے حل کے لیے مولانا کے مشورے و تجاویز' اس میدان میں حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ مولانا کے نظریات بھی تبدیل ہوتے رہے اور ان کی تحریروں میں مختلف رنگ نمایاں ہوتے رہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے حصص اول و دوم میں وہ مسلم قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں لیکن اسی کتاب کے حصہ سوم میں جو ۳۹-۱۹۳۸ء میں لکھی گئی وہ مسلم قوم پرستی کو کفر کی حد تک پہنچا کر ایک خالص اصولی اسلامی دعوت کے علمبردار بن کر سامنے آتے ہیں۔

اپنے موقف کے ان انقلابات کی توجیہ بیان کرنے کا مولانا مودودی صاحب کو پورا حق ہے۔ اسی طرح ان کے ناقدین کو بھی حق ہے کہ وہ ان کی بیان کردہ توجیہات کو عقل اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ لیکن یہ بہرحال ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام ان نظریات کی اساس پر نہیں ہوا جو مولانا نے سیاسی کشمکش کے پہلے اور دوسرے حصوں میں بیان فرمائے ہیں بلکہ ان پر ہوا ہے کہ جو اس کے تیسرے حصے میں مفصّل و مدلّل بیان ہوئے ــــ ان نظریات کو اساس بنا کر مولانا نے ۴۰ء میں ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی جس کو قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے کہ جو مولانا مودودی کے پہلے سیاسی موقف سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور اس پر شدید تنقیدیں کر چکے تھے۔

لہٰذا "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ۳۹-۱۹۳۸ء سے شمار کی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کے داعی یقیناً مولانا مودودی ہی ہیں' لیکن ان کی جس دعوت پر جماعت اسلامی قائم ہوئی وہ سیاسی کشمکش حصص اول و دوم کی نہیں بلکہ صرف حصہ سوم کی ہے۔ رہے ان کے مخصوص "کلامی نظریات" اور ان کا خاص تصورِ دین و تحریک اسلامی تو جہاں یہ واقعہ ہے کہ وہ اولاً بھی جماعت کی اساس میں موجود تھے اور بعد میں بھی پیہم اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے وہاں یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کچھ اور اہلِ قلم کی تحریروں نے بھی جماعت اسلامی کے تصورِ دین اور تحریکِ اسلامی کے خطوط اور نقوش مرتّب کرنے میں اہم حصہ ادا کیا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف تو اس معاملہ میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ہے کہ جماعت کی تشکیل کے بعد اس کے تحریکی لٹریچر میں مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔

خود تشکیلِ جماعت جس طرز پر ہوئی وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" ایک جداگانہ وحدت (Entity) ہے' چاہے اس کا جزوِ اعظم مولانا مودودی صاحب کی شخصیت ہی قرار پائے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے یہ جماعت اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ کچھ لوگوں نے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہو' بلکہ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگوں نے ایک نصب العین کے بعد' اس کی ایک مخصوص تشریح اور ایک مکمل دستور کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کیا۔ اور پھر انہوں نے اپنے میں سے ایک امیر اور اس کی ایک مجلسِ شوریٰ منتخب کی اور ان کے مابین اختیارات کی حدود کو متعین کر دیا۔

"تحریکِ جماعتِ اسلامی کا دورِ اول" یعنی اس کتاب کا باب دوم اس کا وہ اصل حصہ ہے جس کی اشاعت کے لیے اس پوری کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے۔
اس تحریک کے بنیادی نظریات اور اس کے اساسی تصورات کا جو مرقّع میں نے

پیش کیا ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے جزوی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس تحریک کے افکار و نظریات کی صحیح عکاسی نہیں ہے! جماعت اسلامی کی یہ شبیہ میرے ذہن و وجدان کے داخلی پردوں پر تو منقش ہے ہی اس کی صحت پر خارجی شواہد بھی مجھے اتنے ملے ہیں کہ اس پر میرا یقین انتہائی پختہ ہوتا چلا گیا۔ جماعت اسلامی سے عملی یا ذہنی دلچسپی رکھنے والے جس شخص نے اسے پڑھا اس نے اس امر کی گواہی دی کہ واقعتاً جماعت اسلامی کی صحیح تصویر یہی ہے، حتیٰ کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جو نومبر، دسمبر ۱۹۵۶ء میں مسلسل دو ہفتے جاری رہا تھا اور جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر غور ہوا تھا، جب یہ فرمایا کہ "میں ہر رکنِ شوریٰ کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس بیان کو ضرور پڑھے، اس کے مصنف نے ہماری ہی تحریروں سے مرتب کر کے ایک آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس میں ہم اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں" تو میرے نزدیک یہ جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے طریق کار کے بارے میں میرے پیش کردہ تصور کی صحت پر آخری خارجی دلیل ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفصل بیان کے تحریر کرنے سے بھی مقصود یہی تھا اور اب اس کی اشاعت سے بھی مطلوب یہی ہے کہ کسی طرح اس تحریک کی تجدید اور اس کے احیاء کی صورت پیدا ہو جسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی لیکن جسے اس نے تاریخ کی ایک ہی کروٹ پر پیٹھ کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔

میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی و جہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدتِ ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرۂ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادتِ حق علی الناس کی کوشش ہے۔ یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اسی طرح آج بھی حق ہے کہ امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس ہی یہ ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ [۶] اور وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [۷] اور آج جب کہ یہ امت بحیثیتِ مجموعی اپنے اس اصل فرضِ منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے' اس امت میں سے صحیح راہ پر وہی ہیں جو کم از کم وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ [۸] کے مصداق بن جائیں۔

میرے نزدیک اگر آج سے پچیس سال قبل مسلمانانِ ہند تقریباً مجتمع ہو کر اپنے قومی و ملی تشخص کے تحفظ اور غیر مسلم اقوام کے معاشی و تہذیبی تسلط سے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے اور ان مقاصد کے لیے حصولِ پاکستان کی جدّوجہد میں مصروف تھے تو نہ وہ کفر تھا اور نہ ہی اگر آج جماعت اسلامی نظریۂ پاکستان کی سب سے بڑی علمبردار بن کر تحریکِ مسلم لیگ کی وراثت حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے تو یہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گئی ہے ـــــ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جب کہ ملی و قومی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے نہ پہلے کم تھے نہ آج مفقود ہیں' وہاں اس جگہ کو پُر کرنے والا کوئی

[۶] سورۂ آل عمران' رکوع ۱۲:۔ "تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں' حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۷] سورۃ البقرہ' رکوع ۱۷:۔ "اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۸] سورۂ آل عمران' رکوع ۱۱:۔ "اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے۔ اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نہیں رہا جو جماعت اسلامی نے اپنے انتقالِ موقف سے خالی کی ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی واُمّی کی حیاتِ طیبہ میں چند مواقع ایسے ملتے ہیں جن پر حضور ﷺ کے قلبِ مبارک میں انسانی جذبات بے اختیار اُمڈے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں کا ایک موقع وہ ہے جب حضور ﷺ غزوۂ احد سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے دیکھا کہ پوری بستی عورتوں کے نوحے اور بین کی آواز سے گونج رہی ہے' اُس وقت حضورؐ کو بے اختیار اپنے عزیز اور محبوب چچا اور بچپن کے رفیق اور ساتھی بلکہ رضاعی بھائی حضرت حمزہؓ یاد آئے اور وفورِ جذبات میں یہ الفاظ آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکل گئے "اما حمزۃُ فَلا بواکیَ لَہ!!"... آہ! حمزہؓ کا رونے والا کوئی نہیں—!!— بالکل یہی حال آج اس دین کا ہے جو "بڑی شان سے" جزیرہ نمائے عرب سے نکلا تھا لیکن آج ایسا "غریب الغرباء" بن گیا ہے کہ اس کے لیے رونے والا کوئی نہ رہا۔ فرمانِ نبویؐ "بَدَأَ الِاسلامُ غریبًا وَ سَیَعُودُ کَمَا بَدَأ" تو مجسّم اور متشکّل نگاہوں کے سامنے موجود ہے لیکن آنکھیں اُن غرباء کو ترس رہی ہیں جو اس غربت اور اجنبیت کے دور میں اس غریب کے ہمدرد و مُونس و غمخوار ہوں!—— اور فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِؐ کی نوید کے حق دار بن سکیں۔ یہ دین بیگانوں کی ناخوشی کا کیا شکوہ کرے جب کہ اس کے اپنوں کی خفگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے قومی' ملکی اور ملی مسائل میں ایسے گُم ہیں کہ انہیں اس کی ہمدردی تک کا وقت نہیں ملتا اور اگر کبھی ان میں سے چند راہ رو چند قدم اس کے ساتھ چلتے بھی ہیں تو جلد ہی تھک ہار کر بیٹھ رہتے ہیں اور یہ پھر ویسے کا ویسا تنہا رہ جاتا ہے!!

اگر میری اس تحریر کی اشاعت سے اس "غریب الغرباء" کے پرانے رفقائے سفر میں سے کچھ اس کی رفاقت پر از سرِ نو کمرِ ہمت کس لیں تو بس یہی اس کی اشاعت

ؐ حدیث نبوی ﷺ :۔ "اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی اور جلد ہی یہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا۔۔۔ تو مبارک باد ہو اجنبیوں کو!"

سے مطلوب ہے!

تحریکِ جماعتِ اسلامی کے دورِ اول سے متعلق اپنی تحریر کے اختتام پر (اس کتاب میں صفحہ ۱۰۳) میں نے عرض کیا تھا:

"یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی' اس لیے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہرحال موجود تھیں جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے اپنی محدود بصیرت کے مطابق کلام کرنا ہے......"

لیکن اس وعدے کے پورا کرنے کی نوبت نہ آئی' اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس بیان کی تحریر کے فوراً بعد سے جماعت اسلامی کے حلقے میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور کسی معقول بات کے کہنے سننے کا موقع ہی نہ رہا___ تاہم اس جگہ اس پر مختصر کلام مناسب ہے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب بیک وقت داعیٔ دین بھی ہیں اور متکلمِ اسلام بھی اور ان کی دعوت کی رگ و پے میں فطری طور پر ان کے کلامی نظریات سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا مودودی اس دور کے متکلم ہیں جب کہ دنیا مختلف "نظام ہائے حیات" کے نظری و فکری ادوار سے گزر کر عملی زندگی کی نہج قرار پانے اور پھر ان کے باہمی تصادم کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں مولانا مودودی صاحب نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ انہیں ایک "بہترین نظامِ حیات" اور "انسانی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل" نظر آیا۔ چنانچہ یہی ان کی دینی فکر کا مرکزی نقطہ بن گیا جس کے یمین و یسار انہیں اسلام کے عقائد' اس کی عبادات اور اس کی شریعت کے تفصیلی احکام صف بستہ نظر آئے' اور اس طرح انہیں دین کا اصل مطالبہ یہ نظر آیا کہ اس نظامِ کُلی کو نظامِ زندگی پر عملاً نافذ کر دیا جائے___ یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن مولانا مودودی صاحب کی تحریروں پر ان کا اس قدر غلبہ ہے کہ دین کے دوسرے پہلو مثلاً بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اس میں

عبدیت' انابت' اِخبات' تضرع اور اخلاص منجملہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ــــ اور جماعت اسلامی کی تحریک میں فرد پر اجتماعیت' باطن پر ظاہریت' اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی اس طرح چھاگئے کہ اس کے کارکنوں کی زبان پر اگرچہ "نجاتِ اخروی" بھی رہی لیکن ان کی عملی سعی وجُہد کا اصل مرکز و محور دنیا میں "اقامتِ دین" بن کر رہ گئی۔

اس موضوع پر مفصل لکھنے کی نوبت شاید پھر کبھی آئے۔ اِس وقت میں اس قدر کافی سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک اہم سابق رکن اور وہاں کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر وحید الدین خاں صاحب کی کتاب "تعبیر کی غلطی" کا تذکرہ کر دوں' اس کتاب کا اصل موضوع وہی ہے جو اوپر بیان ہوا اور اس پر خان صاحب موصوف نے جس قدر محنت کی ہے اور دین کے اس دوسرے پہلو کو جو جماعت اسلامی کی تحریک میں دب کر رہ گیا ہے جس طرح اجاگر کیا ہے اس کے لیے وہ شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک خان صاحب موصوف بھی فرد اور جماعت اور ظاہر و باطن کے مابین مقامِ عدل پر قائم نہیں رہ سکے ہیں بلکہ ان کی تحریر میں دوسرا پہلو قدرے غالب آگیا ہے اور اجتماعیت کے حقوق مجروح ہوئے ہیں۔ تاہم کتاب کا مطالعہ' تصویر کے دوسرے رخ اور اس کی اہمیت کو نگاہوں کے سامنے لانے میں انتہائی مفید ہے!!

"دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات" کا باب محض تقابل کے لیے ہے! اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کے بعض حصوں کو حذف بھی کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں اس دیباچے میں مجھے مزید کچھ عرض نہیں کرنا ہے' میں نے اس حصے میں بھی جماعت اسلامی کی پالیسی پر اصولی تنقید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان احوال و کوائف کا اس بیان کی تحریر کے وقت تک مجھے بہت ہی کم علم تھا جن کی تفصیلات جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیے جانے والے دوسرے بیانوں خصوصاً ملک سعید صاحب کے بیان میں درج

تھیں ـــــ جائزہ کمیٹی کے بزرگ رکن جناب عبدالجبار غازی صاحب نے بعد میں ایک موقع پر مجھے بتایا کہ تمہارا بیان پڑھ کر میں نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ نوٹ کیے تھے:

"حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان جو ہمارے مقابلے میں جماعت اسلامی میں بالکل نووارد کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے حالات اور واقعات کا علم بہت کم ہے محض لٹریچر کے منطقی تجزیے سے ان نتائج تک پہنچ گیا ہے جن تک ہم بوڑھوں کی رسائی تمام حالات اور واقعات کے بچشم سر مشاہدے سے ہوئی ہے"۔ (روایت بالمعنیٰ)

اور جیسا کہ عرض کیا گیا میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس بیان کی تحریر کے وقت تک ان "حالات و واقعات" کا علم مجھے نہ ہونے کے برابر تھا جن پر مشتمل جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں ایک صاحب نے فرمایا تھا کہ "جائزہ کمیٹی کی رپورٹ غلاظت کا ایک ٹوکرا ہے جس میں پوری جماعت میں جھاڑو پھیر کر اور اس کا گند سمیٹ کر جمع کر دیا گیا ہے ـــــ!"

بیان کا آخری حصہ "تبدیلی کیوں؟" ہے' اس موضوع پر اس بیان کی تحریر کے بعد اپنی اس تقریر میں جو مولانا مودودی صاحب نے فروری ۵۶ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں کی تھی اور جو اب "تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" کے نام سے طبع شدہ موجود ہے مفصل کلام کیا ہے۔ لیکن ذرا تجزیہ کیا جائے تو وہ اس سے پانچ سال قبل کی تحریر "جماعت اسلامی' اس کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل" میں بیان کردہ وجوہات ہی کی مزید تشریح ہے اور ان کا تفصیلی جائزہ میں اپنے اس بیان سے لے چکا تھا' لہٰذا کسی مزید گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔

کتاب کے آخر میں "ضمیمہ" کے طور پر میں نے تین قراردادوں کو جمع کر دیا ہے:

ایکؔ اجتماعِ ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ میں راقم الحروف کی پیش کردہ قرارداد جو گویا کہ اس بیان کا خلاصہ ہے جو اس اجتماع میں بہت سی وجوہات کی بنا پر بری طرح ناکام ہوئی۔

دؔوسری وہ قرارداد جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض کے بعد مرکزی مجلس شوریٰ نے دسمبر ۱۹۵۶ء میں پاس کی تھی اور جو جماعت اسلامی کے "مخلصین" کی اس کوشش کا مظہر ہے کہ دو مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے گروہوں کو کسی طرح متفق کر کے جماعت کو انتشار سے بچایا جائے اور جس میں ایک طرف اس خطرے کا سدِ باب کیا گیا کہ اگر یہ اعتراف کر لیا گیا کہ ہم نو دس سال ایک غلط راستے پر چلتے رہے ہیں تو نہ صرف یہ کہ جماعت کے کارکنوں کی ہمت شکنی ہوگی اور ان میں کام کرنے کا جذبہ باقی نہ رہے گا بلکہ جماعت کی قیادت پر سے ان کا اعتماد بالکل اٹھ جائے گا اور اس کا وہ وقار باقی نہیں رہے گا جو نظمِ جماعت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ "تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے" کے بارے میں دو آراء کے امکان کو تسلیم کرنے اور "بعض مضر نتائج" کے بر آمد ہونے کے اقرار کے ساتھ ساتھ کارکنانِ جماعت کو اطمینان دلایا گیا کہ "جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے"۔

دوسری طرف جماعت کی بعد از تقسیم کی پالیسی میں نہ صرف یہ کہ عدم توازن کا اقرار کیا گیا جس کی بنا پر جماعت کے "بنیادی کام میں بڑی کسر رہ گئی ہے" ــــ بلکہ عملاً اس طریق کار کے ایک ستون یعنی انقلابِ قیادت بذریعہ انتخابات کو بالکل ہی منہدم کر دیا گیا اور دوسرے ستون یعنی "دستورِ اسلامی کے تحفظ، اصلاح اور نفاذ" کے لیے بھی بس "ناگزیر" اقدامات کی اجازت برقرار رکھی گئی۔

اور تیسؔری مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ فروری ۱۹۵۷ء بمقام ماچھی گوٹھ کی وہ قرارداد جسے اجتماع ارکان میں مولانا مودودی صاحب نے پیش کیا اور جس کی تشریح میں مولانا نے دو نشستوں میں چھ گھنٹوں کی وہ مفصل تقریر کی جو اَب "تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے ـــــ اس قرارداد نے جماعت کی

بعد از تقسیمِ ہند کی پالیسی کی مکمل توثیق کی اور اسی پالیسی کو آئندہ کا لائحہ عمل قرار دیا۔

اس قرارداد اور اس کی شارح تقریر پر یہاں تفصیلی گفتگو کا موقعہ نہیں ہے۔ صرف اس قدر عرض ہے کہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور منطقی استدلال کی پیچیدگیوں سے صرفِ نظر کر کے اس قرارداد اور تقریر کے بین السطور میں دیکھئے کہ آج سے نو دس سال قبل پاکستان میں تحریکِ اسلامی اس کے داعی کے بیان کے مطابق کس مقام تک پہنچ چکی تھی اور ایک نظر آج کے حالات اور نو دس سال کی مزید "پیش قدمی" کے بعد پاکستان میں اسلام یا تحریک اسلامی کی حالتِ زار پر ڈالیے تو شاید غیر اختیاری طور پر علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی جانب ذہن منتقل ہو جائے کہ ؎

محکوم ہے بے گانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

اس تحریر کو ختم کرتے ہوئے میں اپنے رکنیتِ جماعت سے استعفاء کے آخری دو پیرے نقل کرنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ آج اس تحریر کی اشاعت سے پھر شاید میرے کچھ بزرگ اور دوست اسی طرح دل گرفتہ ہوں جیسے میرے مستعفی ہونے کے وقت ہوئے تھے —— اُس وقت اِس سلسلے میں 'مَیں نے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا تھا' آج بھی میرے جذبات وہی ہیں:

"جماعت کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۴۷ء سے' شعوری ہمدردی کا تعلق ۵۱ء سے (جب کہ میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گزشتہ سوا سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصے میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقے میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں' محبتیں اور الفتیں' حتیٰ کہ رشتے داریاں تک اسی حلقے میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعۃً اس حلقے سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں' کتنے ہی

بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے ـــــ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا!

میں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اُس وقت بھی اسے کوئی بچوں کا کھیل نہ سمجھا تھا۔ اور آج جب کہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں نہیں کر رہا۔ اپنے بیانِ جائزہ کمیٹی کے تحریر کرنے سے ایک سال قبل سے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں اور اس واقعے کو بھی آج چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں مَیں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ بھی، اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ بھی دونوں ہی طرح مسلسل غور کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے راہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب اندر آیا تھا تو رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا کے ساتھ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ کی دعا کرتا ہوا آیا تھا اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے وَاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔

جن حالات اور کیفیات سے گزر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے وہ میں نے اپنی حد تک صحیح صحیح اور صاف صاف بیان کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد بھی کسی "نفسیاتی تجزیے" کی ضرورت ہو تو جماعت کے کئی اہل قلم کو ماشاء اللہ اس میں مہارتِ تامہ حاصل ہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا

کہ ایسے کسی تجربے سے کوئی فائدہ ہی اٹھا سکوں۔

آخر میں دست بدعا ہوں: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا وَ شَاھِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِیْرِنَا وَ کَبِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثَانَا۔ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ○

(تحریر ۲۹/ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ بحالت اعتکاف)

اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں حق تلفی ہوگی اگر برادرم محی الدین سلفی صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جن کا اصرار اس کی طباعت کا فوری محرک بنا اور جن کے عملی تعاون ہی سے اس کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اس کتاب کی اشاعت اگر کسی خیر کا ذریعہ بنے تو یقیناً وہ اس کے ثواب میں سے حصہ پائیں گے اور کوئی شر اس سے پیدا ہوا تو وہ صرف میرے "شرورِ نفس" کی وجہ سے ہوگا' وہ اس سے بری ہیں —— فقط

خاکسار اسرار احمد

لاہور - مارچ ۱۹۶۶ء

مقدّمہ

- ابتدائیہ
- کچھ اپنے بارے میں
- اعتذار

ابتدائیہ

ہر وہ خیال جو صفحۂ قرطاس پر پیش کیا جائے زیادہ نہیں تو بہر حال تھوڑی بہت سوچ بچار اور ذہنی کشمکش کی منزلیں طے کر کے اس حد تک پہنچتا ہے کہ اسے متعین الفاظ کے ساتھ پیش کیا جا سکے!

صفحاتِ آئندہ میں مَیں جن خیالات کا اظہار کر رہا ہوں وہ بھی ذہن میں کوئی آج ہی پیدا نہیں ہو گئے ہیں بلکہ یہ بھی سوچ بچار کی بہت سی منازل طے کرنے کے بعد آج اس قابل ہوئے ہیں کہ انہیں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

یہ پورا عرصہ جس میں یہ خیالات ذہن کا بار بنے رہے ہیں' میں نے ایک شدید ذہنی کشمکش اور روحانی اذیت میں گزارا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ایسی چیز کہ جس کے لیے ایک شخص پوری زندگی کی بازی کھیلنے کو تیار ہو اور جس کے لیے نقدِ جان پیش کر چکا ہو' اگر اسی کی طرف سے ذہن مطمئن نہ رہے اور دلی اطمینان باقی نہ رہے تو اس سے زیادہ اذیت بخش چیز اور کون سی ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تقریباً پورا ایک سال کا عرصہ مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ جس میں فرصت کے تمام لمحات اسی سوچ بچار میں گزرے ہیں۔ دنیا کی دوسری مصروفیات نے جب بھی ذہن کو ذرا مہلت دی ہے یہ خیالات فوراً آموجود ہوئے ہیں اور اُس وقت تک ذہن میں ڈیرہ جمائے رہے ہیں جب تک کہ کسی اور ناگزیر ضرورت نے توجہ اپنی جانب مبذول نہیں کرا لی ہے۔

اس دوران میں کئی بار جب یہ مواد ذہن میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک اٹھتا تھا تو خیال آتا تھا کہ جماعت کے کسی ذمہ دار شخص کے سامنے یہ سارا معاملہ رکھ

کر ذہن کا بوجھ ہلکا کرلوں، لیکن دُو وجوہات کی بنا پر یہ ارادہ عمل کا جامہ نہ پہن سکا۔

● — اولاً ع "ایاز قدرِ خود بشناس" والا معاملہ کہ کہاں میں اور کہاں یہ باتیں۔ آخر یہ پوری جماعت اکابر اور اصاغر سمیت جو ایک سمت میں چلی جا رہی ہے تو آخر کوئی تو بات ہے کہ جس کی کُنہ تک میں نہیں پہنچ سکا ہوں۔ اتنے عظیم مرتبۂ علمی کے لوگ جب اس راستے پر چل رہے ہیں تو ضرور یہ راستہ درست ہی ہو گا۔ میں اپنی کوتاہ بینی اور کم فہمی کی بنا پر اسے سمجھ نہیں سکا ہوں، پھر خیال آتا کہ بات تو کرو اور کچھ نہ ہوا تو کم از کم اپنی غلطی تو تم پر واضح ہو ہی جائے گی۔ ایک مرتبہ تو اس خیال نے اس قدر زور باندھا کہ محض اس سلسلے میں گفتگو کرنے کی غرض سے میں ملتان جیل مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ لیکن کچھ اس وجہ سے کہ تنہائی اور تخلیہ میسر نہ آسکا اور زیادہ تر مولانا کے علمی دبدبے کی بنا پر کھل کر بات نہ ہو سکی۔ صرف ایک سوال کر سکا کہ "مولانا ۱۹۴۷ء میں جو راستہ اختیار کیا تھا اسے کب تک آزمانے کا ارادہ ہے؟" —— اس کا جو جواب مولانا نے دیا وہ یہ تھا کہ "میں ابھی تک اس راستے کے لیے دروازے بند نہیں پا رہا ہوں!"

● — ثانیاً — میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میں اپنی آراء میں منفرد ہوں۔ پوری جماعت میں کوئی میرا ہم خیال موجود نہیں ہے! — اِس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا! --- اس خیال سے مجھے خود اپنے موقف پر پورا اعتماد نہ ہوتا تھا اور اس کے باوجود کہ جہاں تک عقل کام کرتی تھی مجھے اپنی بات صحیح ہی معلوم ہوتی تھی، اس کے کہہ گزرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہر بار زبان کو یہ خیال وا ہونے سے روک دیتا تھا کہ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

عام اسلوبِ بیان میں اسے اتفاق ہی کہا جائے گا لیکن ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہ بہرحال اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت ہی کے تحت ہوا کہ میری ملاقات جناب محمد

اجمل خاں لغاری صاحب [1] سے ہو گئی۔ ان کے ساتھ ایک طویل گفتگو ہوئی جس کا ماحصل یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ

ع "گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!"

بلکہ معلوم ہوا کہ یہ محفل تو رازدانوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ پہلی ہی گفتگو میں ہر وہ بات کہ جو وہ کہتے تھے اس پر میں اپنے دل میں اور ہر بات جو میں کہتا تھا اس پر وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بہرحال اس انکشاف سے کہ جماعت میں ایک خاصی بڑی تعداد میں ارکان اسی طرز پر سوچ رہے ہیں ایک گونہ اطمینان اور اپنی بات پر قدرے اعتماد پیدا ہوا اور میں نے طے کیا کہ آنے والے سالانہ اجتماع میں اپنی رائے پیش کروں گا۔[2]

میں نے سوچا تھا کہ سالانہ اجتماع کے موقع پر اجتماعِ ارکان میں پیش کرنے کے لیے ایک تحریر تیار کرلوں گا لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ ہوا اور اجتماع سے ایک ماہ قبل سے چند خوادث نے جو اپنے نرغے میں لیا تو سارا وقت انہیں کی نذر ہو گیا اور اجتماع سر پر آگیا اور تحریر تیار نہ کی جا سکی۔ چنانچہ اجتماع میں ایک بوجھل دل کے ساتھ "خالی ہاتھ" حاضر ہو گیا ـــــ

---

[1] جناب سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری، رحیم آباد ضلع رحیم یار خان کے رؤسا میں سے ہیں اور جماعت اسلامی کے اولین ارکان میں سے ہونے کے علاوہ ریاست بہاولپور میں غالباً جماعت اسلامی سے روشناس اور منسلک ہونے والے پہلے آدمی آپ ہی ہیں۔ جماعت اسلامی کی بعد از قیام پاکستان کی حکمت عملی کے بارے میں آپ ابتداء ہی سے مضطرب رہے۔۔۔۔ اور بالآخر غالباً ۱۹۵۹ء میں جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

[2] اجمل صاحب سے میری ملاقات سالانہ اجتماع نومبر ۵۵ء سے دو ایک ماہ قبل حلقہ اوکاڑہ کے اجتماع ارکان منعقدہ اوکاڑہ میں ہوئی تھی۔

وہاں اجمل صاحب ہی نے یہ انتہائی دل خوش کن خبر سنائی کہ جماعت کی موجودہ پالیسی اور طریق کار سے اختلافات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آگیا ہے۔ چنانچہ اطمینان ہو گیا کہ موقع ہاتھ سے نکل نہیں گیا بلکہ اب ایک زیادہ پُر سکون ماحول میں اور زیادہ اطمینان کے ساتھ بات کہنے کا موقع میسر آسکے گا۔

سالانہ اجتماع (نومبر ۵۵ء کراچی) سے واپسی کے بعد سے اب تک ان مسائل پر متعدد اراکینِ جماعت سے تفصیلی گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں۔ آپس کے افہام و تفہیم نے معاملے کے بہت سے ان گوشوں کو بھی نظر کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جو اَب تک اوجھل رہ گئے تھے۔

اب جب کہ جائزہ کمیٹی کے تقرری آنے کی خبر مل گئی ہے اس تحریر کی ابتدا کی جرأت محض اللہ تعالیٰ کی امداد کے بھروسے پر کر رہا ہوں۔ واقعہ ہے کہ قطعاً سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کام میں کیسے کر سکوں گا۔ اولاً اتنے اہم مسائل ـــــ اور میری کم علمی اور ناتجربہ کاری!! ـــــ ثانیاً فنِ تحریر سے نابلدِ محض ہونا کہ انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا بھی نہ کر سکے ـــــ!! تاہم ایک احساسِ فرض ہے کہ جس نے ابتدا کر دی ہے وَاللّٰہ المستعان وما توفیقی اِلا باللّٰہ العلی العظیم ـــــ

اسرار احمد

مورخہ ۲۷/اگست ۵۶ء

۱۱ بجے شب

کچھ اپنے بارے میں

اس موضوع پر کچھ عرض کرنے کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر محسوس ہوئی:

● ایک یہ کہ صفحاتِ آئندہ میں جماعت اور اس کے ان اکابر پر کہ جو اس کی راہنمائی کر رہے ہیں تنقید آ رہی ہے اور یہ چیز ممکن ہے کہ میرے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دے۔ بنا بریں میں نے محسوس کیا کہ ابتداء ہی میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں تو اچھا ہے۔ میں یہ گزارشات پیش کر کے اپنی طرف سے ایک کوشش کر رہا ہوں کہ میری بات کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ سنا جا سکے۔

● دوسرے یہ کہ سننے میں آیا ہے کہ جائزہ کمیٹی نے جو سوالنامہ مرتب کیا ہے اس میں ایک سوال رائے دینے والے شخص کی ذات اور اس کے تعلقِ جماعت کے ساتھ بھی بحث کرتا ہے۔ بحیثیتِ رکن، جماعت اسلامی کے ساتھ میرے تعلق کی میعاد کُل ڈیڑھ سال ہے۔ لیکن حقیقتاً جماعت کے ساتھ میرا تعلق ۴۷ء سے ہی بالکل رکن کا سا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو بھی بالوضاحت پیش کر دوں تاکہ میری بات یکے از "تازہ وارادنِ بساطِ ہوائے دل" کی بات سمجھ کر نظر انداز نہ کر دی جائے!

میری زندگی کے مختلف ادوار حسب ذیل ہیں:

☆ پیدائش (اپریل ۳۲ء) سے میٹرک پاس کرنے تک (۴۷ء) کا زمانہ میں نے ضلع حصار مشرقی پنجاب میں گزارا۔ ظاہر بات ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام اور اس کی زندگی کے اولین سال تو میری بالکل بے شعوری اور ناسمجھی کا زمانہ تھا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں جب کہ میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا، مسلمانانِ ہند کے اعصاب پر مسلم لیگ کی تحریک پورے طور پر مسلّط تھی اور یہی اس کا تسلط کچھ سمجھ اور کچھ بے سمجھی کے ساتھ میرے دل و دماغ پر بھی تھا۔ تاہم اس زمانے ہی میں میرے کان میں جماعت اسلامی کی دعوت

بھی پڑھ چکی تھی۔ جناب مسرت مرزا صاحب (حال ملتان) جناب چودھری نذیر احمد صاحب (حال ملتان) اور جناب غلام محمد بھٹی صاحب کے ذریعے میں جماعت سے متعارف ہوا اور کم از کم اس کا اس حد تک مدّاح ضرور بن گیا کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جس کا میں ایک Active Worker اور Office Bearer تھا) کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودی صاحب پر کوئی طنز کیا جاتا تو میں ان کی طرف سے اپنا پورا زور مدافعت میں صَرف کر دیا کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب اس زمانے میں جماعت کے لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہے تھے۔ (اور اسی مطالعے کے نتیجے میں وہ ۴۸ء میں جماعت کے رکن بھی بن گئے)

☆ حصار سے لاہور آتے ہی یعنی قیام پاکستان کے فوراً بعد میں نے بھی جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا اور جماعت لاہور کے حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً وابستہ ہو گیا۔ جناب ماسٹر شہاب الدین صاحب جو ابھی تک کرشن نگر لاہور ہی میں مقیم ہیں، ہمارے حلقہ کے ناظم تھے اور ان کے ساتھ اس زمانے میں (یعنی ۴۹-۱۹۴۸ء جب کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ ایس سی میں زیر تعلیم تھا) میں نے اَن تھک کام کیا۔ یہ زمانہ جماعت کے مطالبۂ اول کی مہم کا زمانہ تھا اور میں نے اس زمانے میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن میں جماعت کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق اور وابستگی کو بے شعوری کا تعلق اور وابستگی قرار دیتا ہوں۔ ایک عام کارکن کی طرح اگرچہ میں بھی بھاگ دوڑ میں پوری طرح حصہ لیا کرتا تھا لیکن تحریک کے ساتھ میرا یہ تعلق سطحی تھا اور میں ابھی پوری طرح اسے سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ تاہم اس بات کا احساس بھی مجھے جلد ہی ہو گیا تھا۔ ۴۹ء کے اواخر میں، میں میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور اس وقت سے میں نے جماعت اور تحریک کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تو اپنے تعلق کا سطحی ہونا واضح ہوا اور جماعت کی دعوت اپنی پوری گہرائی کے ساتھ دل و دماغ پر منکشف ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک اجتماع میں، میں نے ذیل کے الفاظ کہے تھے:

"خود اپنے حالات کے مشاہدے اور چند قریبی دوستوں کے مطالعے سے جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری بنیادی کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے تحریکِ اسلامی کی بنیادی دعوت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ یہ بات بادی النظر میں آپ کو کافی غلط سی معلوم ہوگی لیکن حقیقت میں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے ——

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دو چار کتب کے مطالعے سے یہ سمجھ لیا کہ ہم اپنے مسلمان ہونے کا مفہوم جان گئے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے چند اجتماعات میں حاضر رہ کر ہم نے یہ سمجھا کہ ہم تحریک کی دعوت کو سمجھ گئے ہیں اور پھر اس محدود تصور کے ساتھ اپنے "فرض" کا جو نظریہ ہم نے قائم کیا وہ یہ تھا کہ دو چار پمفلٹ اِدھر اُدھر بانٹ کر اور محض ذہنی تعیش کے لیے دو چار بحث نما گفتگوئیں کر کے ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک میں اپنا حصہ بھی ہم نے ادا کر دیا ——

طلبہ کی اس اسلامی تحریک [۱] کی سرگرمیوں میں بھی میں نے حصہ لیا ہے جس کی دعوت پر آج ہم جمع ہوئے ہیں اور کالجوں کی فضا سے باہر کے اسلام پسند عناصر [۲] کے ساتھ بھی میں نے کام کیا ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ میرے ذہن میں خدا کی بندگی کا تصور راسخ تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ تھا جو مجھے لیے لیے پھر رہا تھا بلکہ اس لیے کہ خدا کے ان بندوں میں سے جو تحریکِ اسلامی کا علَم اٹھائے ہوئے تھے کچھ لوگوں کی تحریریں مجھے پُرزور معلوم ہوئی تھیں اور میں ان سے مرعوب سا ہو گیا تھا کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں صحیح ہے یا پھر کچھ لوگوں کی تقریروں کا مجھے چسکا پڑ گیا تھا کہ جہاں میں نے سنا کہ فلاں صاحب کی تقریر ہے میں فوراً پہنچ گیا یا پھر اس تحریک کے کارکنوں کو کتب اور پمفلٹ تقسیم کرتے دیکھ کر میں بھی دو چار پمفلٹ اِدھر سے اُدھر کر دیا کرتا تھا اور اس تحریک کی حمایت میں اس کے مخالفین سے پُرزور مباحثے کر لیا کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ بھئی ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ——" (شائع شدہ "عزم" ۱۵/ نومبر ۵۰ء)

---

[۱] اسلامی جمعیت طلبہ

[۲] جماعت اسلامی

اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے تعلق تحریک کے اس تجربے کے بعد آئندہ کے لیے جو مشورے میں نے دیئے تھے —— (اور یہ صرف دوسروں کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی تھے) وہ یہ ہیں:

"اصل چیز تحریک کی بنیادی دعوت ہے اور یہ وہی دعوت ہے جو ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے آقا مالک اور معبود کی حیثیت سے پہچانئے اور تسلیم کیجئے۔ اس کی ہدایت کو ہدایت مانئے اور پھر اپنی پوری زندگی کو اس کی عبادت میں دے دیجئے! .... اپنے اور خدا کے درمیان تعلق کو استوار کیجئے اور خدا کے خوف کو اپنے دل میں جاگزیں کیجئے۔ یہی وہ کمپاس ہے جو آپ کی زندگی کے لیے صراطِ مستقیم متعین کرے گی اور خدا کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنایئے۔ یہی وہ طاقت ہے جو گمراہی کے اس تاریک ماحول میں بڑی سے بڑی تکالیف کے باوجود آپ کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے گی! ......" (ایضاً)

بہرحال یہ میری زندگی کے شعوری دور کی ابتداء تھی۔ اسی زمانے میں' میں اسلامی جمعیت طلبہ کارکن بن گیا۔

☆ ۵۰ء سے ۵۴ء تک میں اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن رہا اور اس میں میں نے ایک عام کارکن اور رکن سے لے کر اس کی نظامتِ علیا تک کے فرائض سرانجام دیئے۔ جو حضرات مجھ سے اُس دور میں واقفیت رکھتے تھے ان کو معلوم ہے کہ میں نے اس پورے عرصے میں جمعیت اور اس کے کام کو اپنی زندگی میں ہر چیز حتیٰ کہ اپنی تعلیم تک پر مقدم رکھا ہے۔ یہاں تک کہ میرے طالب علم ساتھی میری اس محویت اور مشغولیت کی زیادتی کے ہمیشہ شاکی ہی رہے —— لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس پورے چار سال کے عرصے میں ایک دن بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ جس میں میں نے جمعیت کو (اصول اور تحریک کی حد تک) جماعت سے علیحدہ کوئی چیز سمجھا ہو۔ میں اپنی حد تک اسلامی جمعیت طلبہ کو تنظیمی طور پر تو ضرور آزاد اور جماعت سے علیحدہ سمجھتا رہا ہوں

لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اس پورے دور میں، میں نے اپنے آپ کو جماعت اسلامی ہی کا ایک رکن متصور کیا۔ مجھے جو احساسِ فرض جمعیت میں اپنا وقت اور محنت صرف کرنے پر مجبور کرتا رہا، وہ حسب ذیل ہے:

"اس سلسلے میں جو کچھ میں نے سمجھا ہے اور جس پر میں خود عمل پیرا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اصولاً دین کے مطالبات طلبہ سے بھی وہی ہیں کہ جو عام لوگوں سے ہیں۔ دینی فرائض کے اعتبار سے طلبہ اور عام لوگوں میں کوئی امتیازی فرق موجود نہیں ہے۔۔۔۔ دین میں صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے شعور اور غیر شعور کی تقسیم۔۔۔۔ سِن شعور کو پہنچنے سے قبل غیر شعوری حالت میں انسان کسی بھی چیز پر مکلّف نہیں ہے۔ لیکن سِنِ شعور کو پہنچ جانے کے بعد جب کہ انسان میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو جائے وہ ان تمام فرائض پر مکلّف ہو جاتا ہے جو اسلام انسان پر عائد کرتا ہے۔۔۔۔

یہ فرائض کیا ہیں؟ مختصر طور پر اگر بیان کیا جائے تو یہ فرائض دو ہیں:

(i) اولاً — یہ کہ انسان اپنے مالکِ حقیقی کو پہچان کر اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع فرمان کر دے اور اپنی خود مختاری سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ یہ وہ عبادتِ الٰہی ہے کہ جس کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کے لیے واحد لائحہ عمل ٹھہرایا ہے۔

اگر اسلامی ریاست قائم ہو اور شہادتِ حق اور نمائندگیٔ اسلام کا فرض یہ ادارہ سرانجام دے رہا ہو تو افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ کی اطاعت کے طریقے کو اپنا کر، تمام فرائض کو بجا لا کر، برائیوں سے بچ کر اور نیکیوں کا اتباع کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اقامتِ دین اور شہادتِ حق کی ذمہ داری فرداً فرداً افراد پر عائد نہیں ہوتی۔

(ii) لیکن اگر اللہ کا دین بالفعل قائم نہ ہو بلکہ طاغوت غالب ہو تو پھر ہر اُس فرد پر کہ جو ایمان کا دعویٰ کرے اپنی انفرادی زندگی میں "عبادت" کے طریقے

کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ اور یہ وہ دوسرا بڑا فرض ہے کہ جس پر ہر فرد مکلّف ہو جاتا ہے اور جس کی ادائیگی وہ تمام شرائط کے ساتھ اور صحیح صحیح طریقے پر نہ کرے تو اس کی انفرادی طاعت گزاری اور نیکو کاری بھی اس کے لیے بے کار ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں شہادتِ حق اور اقامتِ دین کوئی اضافی نیکی نہیں ہوتی بلکہ عین بنیادی فرض ہے کہ جس کی ادائیگی پر ایمان کے معتبر ہونے کا انحصار ہے!۔۔۔

ظاہر بات ہے کہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں وہ طاغوت کا دور ہے۔ اللہ کا دین قائم نہیں ہے اور اسلامی ریاست کا کہیں وجود نہیں ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں سے جو بھی شعور کو پہنچتا ہے اور غیر مسلموں میں سے اللہ جسے بھی قبولِ حق کی توفیق دیتا ہے اس کے لیے ایک ہی راہ ہے جس پر وہ اللہ اور اس کے دین کی طرف سے مکلّف ہے اور وہ یہ کہ اپنی انفرادی زندگی کو اللہ کی عبادت میں دے دے اور اپنے وقت اور اپنی محنت اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا بس تھوڑا سا حصہ اپنی معاش کے لیے رکھ کر باقی سارے کا سارا شہادتِ حق اور اقامتِ دین کے لیے اجتماعی جدوجہد میں کھپا دے۔۔۔۔

دین کا یہ مطالبہ ہر اس شخص سے ہے جو شعور رکھتا ہو اور وہ ان فرائض پر اسی دم مکلّف ہو جاتا ہے جس دم کہ یہ فرائض اس پر واضح ہو جائیں۔۔۔ اب خواہ وہ ایک طالب علم ہو یا زندگی کے اس دور سے گزر چکا ہو اس کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی میں لگ جائے۔ کسی کا طالب علم ہونا اسے ان فرائض میں سے کسی ایک سے بھی exempt نہیں کر دیتا اور دین میں اس طرح کی کسی تفریق کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔" (تحریر جنوری ۵۴ء)

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ واضح ہو سکے کہ میں اپنی رکنیتِ جمعیت کے دوران بھی تحریکِ جماعتِ اسلامی ہی کا ایک سپاہی

پھر میرا یہ دور چونکہ لاہور میں گزرا جہاں جماعت کا مرکز بھی ہے لہٰذا مجھے جماعت کے اکابرین کے ساتھ ملاقاتوں' گفتگوؤں اور نشست و برخاست کا وافر موقعہ ملا۔ اور اس پورے دور میں مَیں مولانا مودودی صاحب اور مولانا اصلاحی صاحب سے ذاتی ربط قائم کیے رہا۔ اس سے قبل ان حضرات کی صرف تحریریں پڑھی تھیں لیکن اس عرصے میں ان کے ساتھ ذاتی ربط سے مجھے وہ کچھ حاصل ہوا کہ جو محض تحریر پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

☆ ۵۴ء کے اکتوبر میں 'میں ایم-بی-بی-ایس کا آخری امتحان پاس کرکے تعلیم سے فارغ ہوا۔ نتیجہ برآمد ہوتے ہی پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفاء دے دیا اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے بعد یعنی ۱۵/ نومبر ۵۴ء کو میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دے دی۔ میری درخواستِ رکنیت کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:

"میں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامتِ دین میرا فرض ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دور میں پیدا ہوا جب کہ خالصتاً اقامتِ دین کے کام کے لیے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے۔ اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لیے ایک نعمت تصور کرتا ہوں' اس لیے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو خود کام کرنا میرے بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بازپرس کڑی ہو جاتی [چار سال میں جمعیت طلبہ میں رہا ہوں تو اسی تصور کے تحت کہ یہاں کام کرکے میں دراصل جماعت اسلامی ہی کا کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں 'میں نے واضح طور پر مولانا مودودی صاحب امیر جماعت سے استفسار کرکے ان کی رضامندی حاصل کرلی تھی اور اب جب کہ دورِ طالب علمی کے اختتام پر میں جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہو چکا ہوں تو اپنی پہلی فرصت میں یہ درخواست رقم کر رہا ہوں۔ چاہتا تو میں یہ تھا

کہ جس روز جمیت طلبہ سے علیحدہ ہوں اسی روز جماعت کی رکنیت کی درخواست دے دوں اور ایک دن بھی مجھ پر جماعتی زندگی کے بغیر نہ گزرے لیکن صرف اس وجہ سے کہ معلوم نہ تھا کہ کہاں Settle ہوں گا اور کہاں درخواست دینی چاہئے' تقریباً پندرہ دن کی دیر ہو گئی ہے۔ بہرحال آج یہ درخواست دے دینے کے بعد میں مطمئن ہوں گا کہ میں نے اپنی طرف سے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لیے پیش کر دیا ہے اور اس حیثیت سے جب تک میری رکنیت منظور ہو اس وقت تک بھی اپنے طور پر میں جماعت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں گا"۔

(درخواست رکنیتِ جماعت' تحریر ۱۵/ نومبر ۵۴ء)

نومبر ۵۴ء میں درخواستِ رکنیت پیش کر دینے کے بعد ہی میں نے فوراً جماعت کے ارکان کی طرح اپنے آپ کو نظم کا پابند بنا کر کام شروع کر دیا۔ میں اُس وقت اپنی زندگی کے دو انتہائی نازک مراحل سے گزر رہا تھا۔ اولاً اب میری معاشی زندگی کی ابتداء ہو رہی تھی' ثانیاً مجھے اب معاشرتی بندھنوں میں بھی بندھنا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ طالب علمی کے دور ہی سے مجھے ان دونوں مراحل کی نزاکت کا احساس تھا اور اس احساس کو اس مشاہدے نے مزید شدید بنا دیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے کہ جو زمانہ طالب علمی میں جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن بلکہ رکن تک رہے ان دونوں مراحل میں سے کسی ایک کو عبور کرتے ہوئے تحریک کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ مجھے خود اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی اور میں اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے اللہ تعالٰی سے استقامت کی دعا مانگتا رہا تھا — اور آج جب کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ان دونوں مراحل کو کامیابی کے ساتھ طے کر آیا ہوں تو میرے دل کی گہرائیوں سے صدا نکلتی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

درحقیقت تو یہ خدائے بخشندہ ہی کا فضل و کرم ہے لیکن بظاہر مجھے یہ اس بات کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے کہ میں نے جمیعت کے نظم سے آزاد ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو جماعت کے ساتھ باندھنے میں عجلت سے کام لیا۔ اگر میں اس میں ڈھیل دے دیتا اور جماعت کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں دیر لگا دیتا تو حالات کا مقابلہ کرنا نسبتاً دشوار ہو جاتا۔

بہرحال فروری ۵۵ء میں میری درخواستِ رکنیت منظور ہو گئی۔

☆ آج میری رکنیتِ جماعت کو بھی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے — اس عرصے میں اگرچہ (جیسا کہ آگے معلوم ہو گا) مجھے جماعت کی موجودہ پالیسی سے جلد ہی اختلافات ہو گئے تھے تاہم ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور تحریک کے اصول کے بارے میں کوئی شک دل میں پیدا ہوا ہو اور اس کے باوجود کہ میں اپنے اختلافات کا اظہار برملا کرتا رہا ہوں اور آس پاس کے ارکینِ جماعت اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن جماعت اور اس کے کام کے لیے سرگرمی اور محنت میں میرے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے —— آئندہ کے لیے اس دعا کا سہارا لیا کرتا ہوں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً

اپنے بارے میں ان تصریحات سے مجھے دراصل دو باتوں کی وضاحت مطلوب تھی۔ وہ یہ ہیں:

○ ایک —— یہ کہ میں جماعت اسلامی میں نووارد سہی لیکن تحریکِ اسلامی کے ساتھ میرا تعلق نیا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ میرے شعوری تعلق کا عرصہ بھی کم از کم چھ سال ہے اور پھر جیسا کہ میری ۵۰ء والی تقریر کے اقتباس سے ظاہر ہے میں نے اسی

رفقت جماعت کے ساتھ اپنے بے شعوری اور جذباتی تعلق کو شعوری طور پر ختم کر کے اس تحریک کی بنیادی دعوت کو سمجھ کر قبول کیا تھا —— لہٰذا میری بات کو ایک نووارد کی بات سمجھ کر نظرانداز نہ کر دیا جائے بلکہ اس پر کم از کم اتنی توجہ ضرور صرف کی جائے جتنی کسی "پرانے خدمت گار" کی بات پر کی جاتی ہے ——!

○ دوسرے —— یہ کہ میں نے شہادتِ حق اور اقامتِ دین کو اپنے فرائض سمجھ کر ان کی ادائیگی کے لیے جماعت کا دامن تھاما ہے۔ جماعت میں جو کام میں کرتا ہوں وہ جماعت کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کرتا ہوں اور اس کے مسائل کو اس کے نہیں بلکہ اپنے مسائل سمجھ کر میں نے ان پر غور کیا ہے۔ پھر یہ کہ میں نے اس کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کو وابستہ کیا ہے۔ میں اس کے بغیر اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میری ان گزارشات کو Lightly نہ لیا جائے بلکہ اگر یہ جماعت کے ذمہ دار حضرات کو لایعنی اور بے کار نظر آئیں تب بھی ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ میری بات نہ مانی جائے تو کم از کم مجھے تو سمجھایا جائے کہ میری غلطی کہاں ہے اور میرے طرزِ فکر میں ٹیڑھ کس جگہ واقع ہوا ہے۔ اس میں جماعت اور تحریک کا کوئی فائدہ نہ سہی لیکن یہ ذاتی طور پر مجھ پر ضرور ایک احسان ہو گا۔

ایک بات کی وضاحت اور ضروری ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے بارے میں قطعاً کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ یہ چونکہ جماعت کا ایک تنقیدی جائزہ ہے لہٰذا لامحالہ اس میں جماعت کے اکابر پر بھی تنقید آ رہی ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب خدارا ہرگز نہ لیا جائے کہ میں ان حضرات کے مرتبۂ علمی و دینی سے ناواقف ہوں یا میرے دل میں ان حضرات کی عزت یا قدر و منزلت نہیں ہے یا یہ کہ میں اپنے آپ کو ان حضرات کے مقابلے میں کوئی درجہ دیتا ہوں۔ میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے۔ اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے ان حضرات کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے ان حضرات ہی کا فیض ہے اور

ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ میں یہ الفاظ کہتے ہوئے قطعاً تکلف اور تصنّع یا مبالغے سے کام نہیں لے رہا کہ میں اپنے آپ کو ان حضرات کی خاکِ پا کے ہم وزن بھی نہیں پاتا۔

پھر جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ بھی ان حضرات ہی کی تعلیم ہے اور سب کچھ ان ہی سے سیکھا ہوا ہے۔ لیکن کہنے پر مجبور اس لیے ہو گیا ہوں کہ ذہن ہر پھر کر اسی طرز پر سوچتا ہے اور اب کہے بغیر چارہ نہیں رہا' اس لیے کہ اپنے ذہن کو معطل کر کے رکھ لینا میرے بس میں نہیں ہے۔

پھر اللہ گواہ ہے کہ اس بات کے کہنے میں کوئی بری نیت محرک نہیں بنی ہے۔ اس غرض سے یہ گزارشات پیش کر رہا ہوں کہ اگر اس ذریعے سے اللہ تعالٰی ہماری غلطی کو (اگر وہ ہے!) واضح کر دے تو فبہا' ورنہ کم از کم مجھ پر تو اپنی غلطی واضح ہو جائے گی اور میں زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو کر عملاً کام کر سکوں گا۔

وَاللّٰهُ شَاهِدٌ عَلٰى مَافِي قَلْبِي!

اعتذار

۳۰/ ستمبر کو اوکاڑہ میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ یہ تحریر اُس وقت تک مکمل نہ ہو سکی تھی' لہٰذا میں نے زبانی اپنے خیالات کا اظہار جس طرح بن آیا کیا۔ اور اب یہ تحریر مکمل کر رہا ہوں۔

جناب شیخ سلطان احمد صاحب (رکن جائزہ کمیٹی) نے ہدایت فرمائی تھی کہ میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں اختصار سے کام لوں۔ لیکن بوجوہ میرے لیے اس ہدایت پر عمل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اولاً اس بناء پر کہ قدرتِ کلام کہ جس سے "مَا قَلَّ وَدَلَّ" والا معاملہ بن سکے مجھے میسر نہیں ہے اور ثانیاً اس بنا پر کہ مجھے دلی اطمینان مطلوب ہے اور وہ اس وقت تک حاصل نہ ہو سکے گا جب تک میں اپنی بات کو وضاحت سے کہہ کر مطمئن نہ ہو جاؤں کہ میں نے اپنی بات کہہ دی ہے!!

"جائزہ کمیٹی" کا مرتب کردہ سوال نامہ بھی اب پیش نظر ہے۔ اس کو مرتب کرنے میں کمیٹی کو تو اپنی سہولت پیش نظر تھی لیکن مجھے بھی اس سے کافی آسانی محسوس ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ تو ممکن نہ ہو گا کہ میں اپنے اظہارِ خیال میں بالکل سوال نامے کی ترتیب ہی ملحوظ رکھوں تاہم میں کوشش کروں گا کہ جتنا بھی ممکن ہو اسی ترتیب کے مطابق جواب دوں۔

اسرار احمد

۱۴/ اکتوبر ۵۶ء

تحریکِ جماعتِ اسلامی

کا

دورِ اوّل

اور اس کے

بنیادی افکار و نظریات

جماعت اسلامی کی باقاعدہ تشکیل تو اگرچہ ۱۹۴۱ء میں ہوئی لیکن جن نظریات و افکار پر اس کی بنیاد رکھی گئی' وہ اپنی جامع اور واضح شکل میں ان مضامین میں سامنے آئے جو ۳۹-۱۹۳۸ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے قلم سے نکل کر شائع ہوئے اور اب سیاسی کشمکش حصہ سوم کی شکل میں طبع شدہ موجود ہیں۔ تشکیل پا جانے کے بعد جماعت نے ۱۹۴۱ء سے ۴۷ء تک عملاً جس نہج پر کام کیا اس کی تفصیل رودادِ جماعت اسلامی حصص اول تا پنجم میں ملتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی خصوصیات معلوم کرنے کے لیے جماعت کے اسی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا ہو گا!

ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے ـــــ تو "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کے اس دور کی مندرجہ ذیل خصوصیات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

ظاہری اور حقیقی اسلام میں امتیاز:

سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ کہ اس نے "ظاہری اسلام" اور "حقیقی اسلام" اور "نسلی مسلمان" اور "اصلی مسلمان" میں فرق اور امتیاز قائم کیا۔ اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام کو شعوری طور پر اختیار کرنے اور اصلی مسلمان بننے کی دعوت دی۔

مسلمان قوم کے نام سے اُس وقت جو لوگ پائے جاتے تھے (اور جیسے کہ آج کل کے بیشتر مسلمان ہیں) ان کا تجزیہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے اس طرح کیا:

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے

بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ کسی سے کم نہیں ہے......"

(مولانا مودودی: "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم)

"اِس وقت کے مسلمانوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اقسام بے شمار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سانپوں کی قسمیں گن سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اقسام شمار نہیں کی جا سکتیں......"

("دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات" تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

پھر سمجھایا کہ:

"ظاہر ہے کہ مسلمان کی اتنی قسمیں نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان صرف ایک ہی قسم کا ہو سکتا ہے۔ اللہ اور اس کی شریعت کا پابند۔ رسولؐ اور اس کی تعلیمات کا فرمانبردار"۔

("دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات" تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

"مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ اسم صفت ہی ہو سکتا ہے اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام اسلام ہے....."

("مسئلہ قومیت" مولانا مودودی)

یہودیوں اور نصرانیوں کے غلط مزعومات — جیسے "سَيُغْفَرُ لَنَا" — اور "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" — اور — "نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ

وَ اَحِبَّاءُ ہٗ" کی طرح کے غلط اور گمراہ کن نظریات جو مسلمان قوم میں پھیل گئے تھے اور جن کے باعث ایمان بالآخرت لفظی اور لسانی اقرار کے باوجود عملاً بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گیا تھا ــــ ان کا پُر زور اور مدلّل ابطال کیا گیا ــــ اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا کہ تم میں سے ایک ایک کا بے لاگ محاسبہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہونے والا ہے اور محض مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور ظاہری شکل و صورت بنا لینے سے وہاں چھٹکارا نہیں ملے گا بلکہ وہاں قلبی ایمان اور حقیقی اسلام ہی کام آ سکے گا۔ مولانا مودودی کی کتاب "خطبات" کے ابتدائی خطبے جن میں یہ بات کھول کر بیان کی گئی' اگرچہ اسی کلام اللہ کی ترجمانی تھے جسے ہمیشہ سے مسلمان پڑھتے اور پڑھاتے چلے آ رہے تھے لیکن اس ماحول میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک بالکل نئی بات کہی جا رہی ہے۔ رودادِ جماعت اسلامی حصہ سوم کا یہ اقتباس کتنا واضح ہے:

"عام طور پر لوگ فقہی اور قانونی اسلام اور اس حقیقی اسلام میں جو خدا کے ہاں معتبر ہے فرق نہیں کرتے ــــ فقہی اور قانونی اسلام میں آدمی کے قلب کا حال نہیں دیکھا جاتا اور نہیں دیکھا جا سکتا' بلکہ اس کے اقرارِ زبانی کو اور اس امر کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان لازمی علامات کو نمایاں کرتا ہے یا نہیں جو اقرارِ زبانی کی توثیق کے لیے ضروری ہیں ---- یہ چیز صرف دنیا کے لیے ہے اور دنیوی حیثیت سے وہ قانونی اور تمدنی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر مسلم سوسائٹی کی تعمیر کی گئی ہے ---- لیکن آخرت میں آدمی کی نجات اور اس کا مسلم و مومن قرار دیا جانا اور اللہ کے مقبول بندوں میں شمار ہونا اس قانونی اقرار پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہاں اصل چیز آدمی کا قلبی اقرار' اس کے دل کا جھکاؤ اور اس کا برضا و رغبت اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے حوالے کر دینا ہے ---- اللہ آدمی کے دل کو اور اس کے باطن کو دیکھتا ہے اور اس کے ایمان کو ناپتا ہے۔ اس کے ہاں آدمی کو جس حیثیت سے جانچا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس کا جینا اور مرنا' اس کی وفاداریاں اور اس کی اطاعت اور بندگی اور اس کا پورا کارنامۂ زندگی اللہ کے

لیے ہے یا کسی اور کے لیے ---- اگر اللہ کے لیے ہے تو وہ مسلم و مومن ہے اور اگر کسی اور کے لیے ہے تو نہ مسلم ہے نہ مومن!! ------"

("خطبۂ جمعہ مولانا مودودی" روداد جماعت اسلامی' حصہ سوم)

اس طرح قانونی ---- اور حقیقی مسلمان کا فرق واضح کرنے کے بعد جماعت اسلامی نے اپنی دعوت ان الفاظ کے ساتھ پیش کی:

"-----۱۔ یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں"۔

۲۔ یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کردے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنتا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے!! ------"

(دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات)

شاہ ولی اللہ دہلوی ---- اور تحریکِ مجاہدین کے بعد مسلم ہندوستان میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی آواز تھی جس کے بلند کرنے کا شرف جماعت اسلامی کو حاصل ہوا۔ جماعت سے قبل اور اس کی تشکیل کے وقت جو دوسری کوششیں اسلام پسند حلقوں کی طرف سے ہو رہی تھیں وہ زیادہ تر دو طرح کی تھیں۔ ایک مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے قومی تشخص کے تحفظ اور ان کے دنیوی مفاد و فوز و فلاح کی کوششیں ---- اور دوسرے جدید مغربی فلسفہ و سائنس اور افکار و نظریات کے مقابلے میں اسلامی نظریات و افکار و عقائد کے لیے علمی و عقلی استدلال بہم پہنچانے کی کوششیں جن سے جدید علم الکلام معرضِ وجود میں آیا ---- مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بننے اور جس دین کے وہ دعویدار ہیں اس کے فی الواقع متبع اور پیرو بننے کی زوردار دعوت ایک طویل عرصے کے بعد صرف جماعت اسلامی اور اس کے اکابرین کی طرف سے سننے میں آئی ---- اور یہ جماعت اسلامی کی وہ پہلی اور بنیادی خصوصیت ہے جو

اسے دوسری تمام "مسلمان تحریکوں" سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔

غیر مسلموں سے خطاب

"تحریکِ جماعتِ اسلامی" کی دوسری اہم اور بنیادی خصوصیت جو اسے دوسری تمام ہم عصر تحریکوں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ — اس نے اپنی دعوت اور اپیل کو مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر مسلموں تک عام کر دیا۔ وہ دعوتِ بندگیٔ رب (یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ) کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی اور اس دعوت کو اس نے اپنوں اور بیگانوں' غیر مسلموں اور مسلمانوں سب کے سامنے پیش کیا — اوپر "دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات" کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

"ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں"۔

حادثۂ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان کے لوگوں کو ہوش آنا شروع ہوا اور انگریزی اقتدار کو ایک مسلّمہ حقیقت مان کر ہندوستانیوں نے جب اس کے تحت زندگی گزارنے کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا تو فوراً ہی ایک مسئلہ جو بوجوہ پیدا ہو گیا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی مسابقت کا مسئلہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ انتہائی کسمپرسی' انتشار اور مایوسی کا وقت تھا۔ تاریخ کی ایک ہی کروٹ نے انہیں مسندِ حکومت سے گرا کر اپنی سابق محکوم قوم کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔ ان پر اس سانحے کے صدمے کی وجہ سے ایک مدت تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی اور وہ ابھی اسی کیفیت میں گرفتار تھے کہ ہندو جن کے لیے حاکموں کی تبدیلی کا یہ واقعہ اتنا عظیم سانحہ نہ تھا' فوراً نئے حالات کے ساتھ موافقت کی کوشش میں لگ گئے اور "تنازع للبقا" کی دوڑ میں مسلمانوں سے کہیں آگے نکل گئے۔ مسلمانوں کو ہوش آیا اور انہوں نے حالات کا جائزہ لیا تو اس کے سوا انہیں اور کوئی راہ نہ سوجھی کہ ایک طرف اپنی

قومی روایات، اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے قومی تشخص کا تحفظ کریں اور دوسری طرف انگریزی اقتدار کے تحت سرکاری ملازمتوں اور ملک کے دوسرے کاموں میں اپنا، بلحاظ تناسب آبادی، جائز حصہ وصول کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی اس وقت مسلمانانِ ہند کا قومی نصب العین قرار پایا اور اس طرح ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے ساتھ تصادم کی کیفیت رونما ہوئی۔ ابتداءً یہ تصادم صرف سرکاری ملازمتوں اور دوسری سہولتوں کے حصول تک محدود تھا، لیکن ایک عرصے کے بعد جب ہندوستانیوں میں اپنے حقِ خود ارادیت کا احساس پیدا ہوا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدّوجُہد شروع ہوئی تو یہ تصادم مزید وسیع اور نمایاں ہو گیا اور مسلمانوں کا قومی نصب العین یہ قرار پایا کہ "ملنے والی آزادی" میں سے اپنا حصہ اس طرح وصول کیا جائے کہ مسلمان قوم کسی بڑی قومیت میں ضم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اسے اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

ان حالات میں مسلمانوں کی کسی جماعت کا اپنی دعوت اور اپنے اپیل کو مسلمانوں سے بڑھ کر غیر مسلموں تک عام کرنا بے حد کٹھن تھا۔ لیکن جماعت اسلامی نے یہ طریق کار اختیار کیا ـــ اور اگرچہ اس میں جماعت اسلامی کو متعدد وجوہ کی بنا پر، جن میں سب سے زیادہ اہم "مسلمان قومیت" کا صدیوں پرانا تصوّر اور اس میں حالیہ قومی کشمکش کی پیدا کردہ شدّت اور تلخی تھی، کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی، لیکن "تحریکِ جماعت اسلامی" کی تاریخ مرتّب کرنے والا ہر شخص جماعت اسلامی کی اس خصوصیت کو اس کے خصائص میں نمایاں جگہ دے گا۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی نے بڑے زور کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے یہ بات پیش کی کہ "اتمامِ حجت" سے قبل "تکفیر" جائز نہیں ہے۔ کافر تو وہ ہوتا ہے کہ جس پر حق کی دعوت کو واضح کر کے اتمامِ حجت کیا جا چکا ہو اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ آج کے غیر مسلموں کے سامنے آخر اسلام پیش ہی کب کیا گیا کہ ان کے انکار کا سوال پیدا ہو۔

انہوں نے تو اسلام کو صرف اپنی مدِ مقابل قوم کے مذہب کی حیثیت سے جانا ہے' ایک اصولی دعوت اور انسانیت کے لیے ایک پیغام کی حیثیت سے تو ان کے سامنے اسے سرے سے پیش ہی نہیں کیا گیا کہ ان کے اسے رد کرنے کا سوال پیدا ہو۔ لہٰذا انہیں گمراہ اور ضالّ ___ اور قانونی حیثیت سے کافر بھی ضرور سمجھا جائے لیکن حقیقی اور معنوی اعتبار سے انہیں کافر قرار دے کر ان سے براءت اور علیحدگی اختیار کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ خود قانونی اور فقہی اسلام سے آگے بڑھ کر حقیقی اور اصلی اسلام اختیار کرو اور غیر مسلموں کو ان کے قانونی کفر کے باوجود گمراہ اور حقیقت اور دین حق کے واضح نہ ہونے کے باعث بھٹکا ہوا سمجھ کر پوری دل سوزی اور حقیقی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کے ساتھ اسلام کی طرف بلاؤ۔

اسی مفہوم پر مشتمل مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا کوئی مضمون اخبار "کوثر" لاہور میں شائع ہوا تھا' جس پر کسی صاحب نے ناک بھوں چڑھا کر اعتراض وارد کیا' جس کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی ہی کے قلم سے "ترجمان القرآن" ستمبر ۴۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں:

> "آپ کا یہ معارضہ کہ اس مضمون سے ثابت ہو رہا ہے کہ اب جب کہ تبلیغ اور صحیح طریقے سے اتمامِ حجت نہیں ہو رہا ہے تو ہم موجودہ حالات میں ہندو' انگریز' سکھ اور پارسی وغیرہ قوموں کو بھی کافر نہ سمجھیں' نہ کافر قرار دے کر ان سے بیزاری کریں' عجیب و غریب ہے۔ یہ تو بہرحال واقعہ ہے جس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آج تبلیغ اور اتمامِ حجت نہیں ہو رہا ہے اور یہ بھی از روئے شرع مسلّم ہے کہ بغیر اتمامِ حجت تکفیر اور اعلانِ براءت جائز نہیں۔ اب اگر آپ اپنے موجودہ رویے ہی کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یا تو یہ ثابت کیجئے کہ آج تبلیغ اور اتمامِ حجت کے تمام ضروری وسائل بر سرِ کار ہیں۔ یا یہ ثابت کیجئے کہ بغیر تبلیغ اور اتمامِ حجت کے بھی تکفیر اور اعلانِ براءت درست ہے' لیکن جب آپ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں کر رہے ہیں تو ہم

سے یہ مطالبہ کیوں کر رہے ہیں کہ ہم ایک حقیقت کے اظہار سے اس لیے رک جائیں کہ اس سے آپ کے ایک غلط دعوے کی غلطی ثابت ہو رہی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے ہماری صحیح بات کو غلط کرنے کی کوشش کریں اپنے ہی رویّے کو درست کرلیں اور ساری دنیا کی تکفیر اور اعلانِ براءت سے پہلے اس فرضِ تبلیغ و شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کریں جو امّتِ مسلمہ پر واجب ہے"۔ [کلہ]

("ترجمان القرآن" ج ۲۹، ص ۲۵۰)

ایک اصولی اسلامی جماعت

متذکرہ صدر دو خصوصیات کی بناء پر جماعت اسلامی "مسلمانوں کی ایک قومی

[کلہ] اس ضمن میں، اس حقیقت کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفیائے اسلام کے طریق تبلیغ میں ایک اہم نکتہ یہی تھا کہ وہ قانونی کفر و اسلام کے بجائے حقیقی ایمان پر نگاہ مرکوز رکھتے تھے اور اپنے پاس آنے جانے والے غیر مسلموں کو زیادہ بُعد کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے، بلکہ بسااوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی اللہ والے کی خدمت میں کوئی غیر مسلم آتا جاتا رہا اور رفتہ رفتہ اس کے دل میں حقائق ایمانی جاگزیں ہوتے چلے گئے جس کا اسے احساس تک نہ ہوا۔۔۔۔ تا آنکہ کسی وقت کلمہ شہادت کی ادائیگی اور نام اور شکل و ہیئت کی تبدیلی بھی بالکل ایسے ہو گئی جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ "الغزالی" مصنفہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا یہ اقتباس بھی پیش کیا جائے:

"ان کی (امام غزالیؒ کی) رائے میں بجز ان کفار کے جن کے سامنے اسلام کی حقیقت پورے طور پر ظاہر کر دی جائے اور پھر وہ ایمان نہ لائیں باقی سب مجبور و معذور ہیں۔ چنانچہ رسالہ "تفرقہ" میں لکھتے ہیں: بل اقول اکثر النصارٰی والترک فی ھذا الزمان تشملھم الرحمۃ ان شاء اللہ (بلکہ میں کہتا ہوں کہ اکثر نصارٰی روم اور ترک جو ہمارے زمانہ میں ہیں ان کو رحمت الٰہی ان شاء اللہ شامل ہو گی)۔"

جماعت " بننے کے بجائے ایک "اصولی اسلامی جماعت " بنی۔ جس کا مقصدِ وحید اسلام کی سربلندی اور اس کا بول بالا کرنا تھا اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ اسلام اس "قوم" کا "مذہب" تھا کہ جس کا وہ بھی ایک جزو تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی نگاہ میں وہی "حق" تھا اور اسی میں پوری نوعِ انسانی کی دنیوی اور اخروی فلاح تھی۔

۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات کو پس منظر میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات اُس وقت لوگوں کو کس قدر انوکھی محسوس ہوئی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستانی مسلمانوں میں "مسلم قومیت" کا جذبہ روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا اور مسلمانانِ ہند کا قومی نصب العین یہ قرار پا چکا تھا کہ جب تک انگریز موجود ہے اس کے ماتحت رہتے ہوئے ان تمام حقوق و رعایات سے اپنی تعداد کے تناسب سے حصہ حاصل کیا جائے جو وہ محکوم ہندوستانیوں کو دیں۔ اور جب ہندوستان آزاد ہو تو اس آزادی سے مسلمان اس طرح متمتع ہوں کہ انہیں اپنے قومی تشخص کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلسل تصادم اور کشمکش کے باعث یہ "مسلم قوم پرستی" جس تیزی کے ساتھ مسلمانوں کے ذہنوں میں سرایت کر رہی تھی اور اس کی جڑیں جس سرعت کے ساتھ مضبوط ہو رہی تھیں اس کا اندازہ "سیاسی کشمکش، حصہ سوم" کے دیباچہ کے حسب ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے:

> "اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزو اتنا کم اور قوم پرستانہ جزو اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں....."

"مسلم قومیت" اور "مسلمان قوم پرستی" کے اس گمراہ کن تصور اور نظریے کے خلاف جماعت اسلامی نے علَم جہاد بلند کیا' خود ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے سرگرمِ کار ہوئی اور مسلمانوں پر واضح کیا کہ تم نے ایک بالکل غلط پوزیشن اختیار کر لی ہے' تم باصطلاحِ معروف ایک "قوم" بن کر رہ گئے ہو حالانکہ تمہارا مقام ایک اصولی جماعت (Ideological Party) کا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات: (از "مسئلہ قومیت" مصنفہ مولانا مودودی)

"قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں"۔

---- "دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنوں میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ "اُمّت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے مجتمع کر دیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصلِ مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے اُمّت کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی امت کہے جاتے ہیں' ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی امت کہے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بناء پر اُمّت کہا گیا ہے' وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ— اور وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا— ان آیات پر غور کیجیے۔ "بیچ کی اُمّت" سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) کا نام ہے"۔

.....”تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ ”جماعت“ ہے اور یہ لفظ بھی حزب کی طرح بالکل پارٹی کے ہم معنی ہے۔ ”عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ“ اور ”يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ“ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ قوم یا شعب یا اس کے ہم معنیٰ دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے جماعت ہی کی اصطلاح استعمال کی.... اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے قوم کے بجائے جماعت، حزب اور پارٹی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں.....“

ان اصولی وضاحتوں کے بعد موجود الوقت کیفیت پر کس قدر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے.....:

”لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل گم ہی ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک ”قوم“ بن کر رہ گئے ہیں“۔

اور

”اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر ”قومی مفاد“ کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف ”اسلامی مفاد“ بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد یا قومی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس دولت آئے، ان کی عزت بڑھے، ان کو اقتدار نصیب ہو اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا بن جائے، بلا اس لحاظ کے کہ یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں

یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں' چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرز عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفتِ اسلام سے قطع نظر کرکے بھی ایک جسم کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسم ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت' ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی اور ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں۔ خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اصولِ اسلام کے منافی ہی کیوں نہ ہو"۔

مسلم قوم پرستی کی بجائے اسلام پرستی جماعت اسلامی کے بنیادی خصائص میں سے وہ تیسری اہم خصوصیت ہے جو پہلے دو خصائص کی ترکیب سے وجود میں آئی۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت

قوم پرستانہ نصب العین کو چھوڑ کر جماعت اسلامی نے جو نصب العین اختیار کیا اور جسے قبول اور اختیار کرنے کی دعوت اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی وہ "حکومتِ الٰہیہ" کا قیام ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ تشکیلِ جماعت کے وقت مسلمانانِ ہندوستان کی قومی جدوجہد دو چیزوں پر مرکوز تھی۔ اولاً —— دورِ محکومی میں حکمران قوم کی طرف سے عطا کردہ حقوق و رعایات میں سے بلحاظِ تناسبِ آبادی اپنے جائز حصے کا حصول اور ثانیاً —— بصورتِ آزادی اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضمانت۔ ۱۹۴۰ء-۱۹۴۱ء کے آس پاس جب کہ جماعت اسلامی قائم ہوئی مؤخر الذکر شق میں مسلمانانِ ہند کی نگاہیں "حصولِ پاکستان" کے نصب العین پر جم گئی تھیں —— لیکن اس وقت جماعت اسلامی نے ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے قیامِ حکومتِ الٰہیہ کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے رکھا۔

"سیاسی کشمکش، حصہ سوم" کے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کی تشکیل کی دعوت ان الفاظ میں دی:

"جو کچھ عرض کیا جاچکا ہے اس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں:

"ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ کلّی اور اساسی تغیر صرف اس طریق پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔

تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے اور نہ اس طریق پر ہے۔

اس توضیح کے بعد بلا کسی تمہید کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو حقیقی معنوں میں "جماعتِ اسلامی" ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کرے......"

اور پھر جماعت کی تشکیل کے بعد جماعت اسلامی کا جو دستور مرتب ہوا اس میں عقیدہ کی تشریح کے بعد اس کا "نصب العین" واضح طور پر ان الفاظ میں ثبت ہوا:

"دفعہ ۴۔ جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومتِ الٰہیہ اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے"۔

"نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں" نامی مضمون میں مولانا مودودی صاحب نے "قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کے دعوے کے ساتھ قوم پرستانہ نصب العین اور اس کے حصول کے لیے لائحۂ عمل اور صحیح اسلامی نصب العین اور اس کے حصول کے طریق کار کے فرق کو وضاحت کے ساتھ پیش فرمادیا تھا۔

کتنا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے!

"اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے

اس کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں-----!"

پھر قوم پرستانہ طریق کار کی تشریح ملاحظہ ہو:

"ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظامِ معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں اور ان کی تمام جدوجہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام سے یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو-----!"

لیکن ساتھ ہی متنبہ کر دیا گیا کہ:

"مگر خوب جان رکھئے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اسلام کو نہ کسی نسلی گروہ سے کوئی دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات و رسوم سے کوئی لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقا کے میدان میں اتریں اور انتخاب طبعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے-----!"

دوسری راہ-----!!

"لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام، یہودیت اور ہندوازم

کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قوم بناتا ہے بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے ــــ وہ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔"

اور اگر اسے قبول کرنا ہے تو ــــ

"آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرفِ نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمران ہیں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا ہوگا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو' آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکیں گے ــــ آپ کو سختی کے ساتھ ایک بااصول جماعت بنانا پڑے گا۔ ان ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصولوں کو نہ مانتے ہوں اور سب قوموں میں سے ان صالحین کو چن چن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی پڑے گی۔ اپنے اصول سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بنانا پڑے گا جو اپنے اصول کے لئے لڑنے والی ہو' جس کا مقصد اپنی قومی حکومت (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے اصولوں کی حکومت (Ideological State) قائم کرنا ہو ــــ۔"

منہاج الانقلاب الاسلامی

اپنے پیش نظر کام ــــ یعنی حکومتِ الٰہیہ کے قیام ــــ کے لیے جماعت اسلامی نے اس کی مناسبت سے ایک پروگرام تجویز کیا جو اس کے دعویٰ کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق کار سے اخذ شدہ تھا اور پھر پوری شدت کے ساتھ یہ بات

مسلمانوں کے سامنے رکھی کہ حکومتِ الٰہیہ اور اسلامی حکومت تو محض اس ایک ہی طریق سے قائم ہو سکتی ہے۔ تم اگر چاہو حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور اسلامی نظام حکومت کی تشکیل لیکن طریق کار کوئی اور اختیار کرو تو یہ ایک احمقانہ فعل ہو گا اور اس طریق پر سعی و جہد سے اسلامی ریاست ہرگز قائم نہ کی جا سکے گی۔ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" نامی مضمون میں جو مولانا مودودی صاحب نے غالباً ۱۹۴۰ء میں تحریر فرمایا تھا' اس مسئلے کی پوری وضاحت ملتی ہے۔

"نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء" کے عنوان سے مولانا لکھتے ہیں:

"حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو' مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی' نفسیاتی' تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites) کچھ اجتماعی محرکات' کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں' جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے یہ وجود میں آتی ہے"۔

آگے چل کر اسی کی مزید وضاحت ملتی ہے:

"جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے' اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں' اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے' اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں' اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو' جس کا اقتضاء اس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرتاً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جد و جہد سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا

دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہوتی ہے"۔

اس کے بعد "اسلامی حکومت" کی دو بنیادی خصوصیات: یعنی پہلی یہ کہ یہ ایک اصولی حکومت (Ideological State) ہے اور دوسری یہ کہ اس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔۔۔ بیان کرنے کے بعد مولانا اس کے قیام کے فطری اور واحد طریق کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مؤرخ، مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات، مسلم ماہرینِ قانون، مسلم ماہرینِ سیاست۔۔۔ غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں۔ جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر

اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں---- اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث' بے غرض' راست باز' پاک سیرت' ایثار پیشہ' بااصول' خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہو گا۔ اس طرح کی جدوجہد سے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ راستی و نیکی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو گا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی اور طرز کے نظام کے لیے چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخرکار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی حکومت قائم ہو جائے گی جس کے لیے اس طرز پر زمین تیار کی گئی ہو"۔ (ایضاً)

ان الفاظ میں مولانا مودودی صاحب نے "مثبت" طور پر "منہاج الانقلاب الاسلامی" کی تشریح کی۔ اور اس میں دو باتوں کو بالکل واضح طور پر بیان فرمایا۔ ایک یہ کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ہمہ گیر تحریک اٹھے جو پورے معاشرے میں اسلامی نظریات کے مطابق ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کر دے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ حکومت میں فطری تبدیلی اسی وقت متوقع ہو سکتی ہے جب کہ "عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو جائے' اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی اور طرز کے نظام کے لیے چلنا دشوار ہو جائے"۔

"منہاج الانقلاب الاسلامی" کی اس "مثبت تشریح" کے ساتھ ساتھ ایک نظر اس "منفی تعریض" پر بھی ڈال لی جائے جو اُس وقت مسلمانوں کی قومی تحریک اور ان

کے قومی نصب العین اور اس کے لیے اختیار کردہ طریق کار سے کی گئی تو آئندہ کے مباحث میں بہت آسانی پیدا ہو جائے گی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانانِ ہند تقریباً متفق ہو کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر نظریۂ پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک اگرچہ ایک خالص قومی تحریک تھی اور محض قوم پرستی کے جذبہ کے تحت چل رہی تھی لیکن اس میں اصطلاحات تمام کی تمام اسلام سے مستعار لی گئی تھیں اور نظریۂ پاکستان کو اسلامی حکومت کے قیام کے جذبہ سے متصف بیان کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس شور و شغب میں اسلامی حکومت اور حکومتِ الٰہیہ کے مقدس الفاظ کو بے جانے بوجھے بکثرت استعمال کیا جا رہا تھا۔ خود مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں:

> "اس خام خیالی (Lose Thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے، جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے"۔

اس کے بعد "خام خیالیاں" کا باقاعدہ عنوان قائم کر کے مولانا موصوف نے اسلامی حکومت اور اس کے قیام کے لیے طریق کار کے سلسلے میں جو بھانت بھانت کی بولیاں اُس وقت بولی جا رہی تھیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے:

> "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظامِ اجتماعی زندگی

میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی' اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے کیونکہ سوسائٹی بحیثیتِ مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران' نظام حکومت میں نہیں' صرف اس کی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا' اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے' اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں' اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے' بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو گا' اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی' جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم "قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی دے گی اور پھر بھی

اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہو گا تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل اختیار کیوں نہ کریں' اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں۔ جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہو گی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہو گی"۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس دلیل کے جواب میں کہی گئی تھی کہ مسلمانوں کی ایک قومی حکومت (پاکستان) کے قیام سے حکومتِ الٰہیہ کا اصل مقصد حاصل نہ بھی ہو تو کم از کم اس نصب العین کی طرف پیش قدمی اور اس کے لیے سعی و جہد آسان تو ہو جائے گی — کہا گیا کہ:

"اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے' ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کی نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی نظام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ثابت ہو گی؟ کیا وہ لوگ جو بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ اور اس کے وسائل اور اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی

کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا' بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کی بجائے الٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کی نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کا مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ہر کوشش کو کچلیں گے اور انکے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی اگرچہ بہت سے "ملکی" اور "قومی" مسائل موجود تھے لیکن آپؐ نے ان کے حل میں اپنے وقت کو صرف کرنے کی بجائے براہ راست اپنے اصل نصب العین کی طرف اس کے مخصوص طریق کار پر پیش قدمی شروع فرمادی:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی' تمدنی' معاشی اور سیاسی معاملات حل طلب تھے —— رومی اور ایرانی امپریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع بھی ہوتا تھا اور اخلاقی زمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپؐ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت' اخلاقی پستی' افلاس' طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلّط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنے سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کرچکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اسی سے ایک گونہ سیاسی و معاشی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز میں نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب

کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کر لو"۔

اس اقتباس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی نگاہ میں ۴۰-۱۹۴۱ء کی ہندوستانی مسلم قوم پرستی اور اس کے مسائل اپنی اصل کے اعتبار سے مشرکینِ مکہ کی قوم پرستی اور اس کے مسائل سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھی!

مزید توضیح کے لیے دو اور اقتباسات!

۱- تقریر مولانا نصر اللہ خاں عزیز ۲۵/ اپریل ۴۷ء بمقام پٹنہ (از روداد حصہ پنجم)

"اگر آپ فی الواقع نظامِ اسلامی کے قیام کے خواہاں ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کے دلوں کو بدلیے۔ وہ دل ان جسموں کو بدلیں گے جن میں وہ دھڑک رہے ہوں گی۔ پھر وہ اجسام اپنے گھروں اور خاندانوں اور بستیوں اور شہروں کو بدلیں گے جن میں وہ رہتے ہوں گے۔ ان کی سیرتیں' ان کی صورتیں' ان کے معاملات' تعلقات' سیاست' تجارت' معاشرت اور تمدن ہر شے بدلتی جائے گی تا آنکہ وہ ایک ایسی سوسائٹی اور جماعت بن جائیں گے کہ ان کے اندر کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا عملاً چلنا محال اور ناممکن ہو جائے گا اور وہ نظامِ اسلامی وجود میں آئے گا جس کی ہر چیز اسلامی اور ہر جز سر تاپا اسلام ہو گا۔ اسلامی نظام ہمیشہ اسی طریق پر قائم ہوا ہے اور آئندہ جب کبھی قائم ہو گا' اسی طرح ہو گا۔ جو لوگ اس کے سوا کسی دوسرے طریقے کو بھی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اس دھوکے کو جلد از جلد دور کر دیں"۔

("روداد جماعت اسلامی" حصہ پنجم)

۲- تقریر طفیل محمد صاحب قیمِ جماعت' اپریل ۴۶ء/ بمقام الٰہ آباد' (از روداد چہارم)

"علمائے اسلام ہر چوراہے پر خدا کے دین کی بجائے وطنیت یا قومیت کی دعوت لیے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے مشائخ ان قیادتوں کی قبولیت کو واحد ذریعۂ نجات اور معیارِ کفرواسلام قرار دے رہے ہیں جن میں ہر ملحد دہریہ منکرِ خدا اور رسول صرف عبداللہ وعبدالرحمٰن نام بتا کر داخل ہو سکتا ہے"۔

(تقریر بمقام الٰہ آباد —"روداد جماعت اسلامی" حصہ چہارم)

ستمبر' اکتوبر ۴۵ء کے ترجمان القرآن میں "موجودہ سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک" کے عنوان سے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نے جو سوال ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ ہماری جماعت کے مقصدِ قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر اور ازلی وابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے' اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی واجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کردیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے

سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے"۔

اپنے نصب العین اور اس کے حصول کے مخصوص طریق کار کے سوا دنیا کے دوسرے تمام مسائل سے جماعت اسلامی کی عدم دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اس ملک سے باہر دنیا میں مسلمانوں کے دوسرے قومی مسائل سے بھی اس نے قطعی صرفِ نظر کیا۔ قضیۂ فلسطین کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" ستمبر۴۶ء میں فرمایا:

"ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکہ سخت ظلم کر رہے ہیں۔ فلسطین کے معاملہ میں انہوں نے بے انصافی کی حد کر دی ہے..... لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین، یا ہندوستان یا ایران یا ٹرکی کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کشمکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اس مسئلہ پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا دوسرے مسائل کے حل ہو جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"۔

پھر خود ان تمام مسائل کے بارے میں جماعت اسلامی نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ سرے سے کوئی مسائل ہیں ہی نہیں بلکہ صرف "اس غفلت کے شاخسانے" ہیں جو مسلمانوں نے اپنے اصل کام یعنی شہادتِ حق ـــ اور ـــ اقامتِ دین سے برتی ہے۔ اور ان کا حل بھی ان میں سے ایک ایک کے حل کی سعی کرنے سے نہ ہوگا بلکہ صرف

اس طرح ہو گا کہ مسلمان اپنا اصل کام سرانجام دیں:

"حضرات جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں اور یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا خمیازہ کیا بھگت رہے ہیں۔ اس پہلو سے اگر آپ حقیقتِ معاملہ پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ بات خود ہی آپ پر کھل جائے گی کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں جن مسائل کو اپنی قومی زندگی کے اصل مسائل سمجھ رکھا ہے اور جنہیں حل کرنے کے لیے وہ کچھ اپنے ذہن سے گھڑی ہوئی اور زیادہ تر دوسروں سے سیکھی ہوئی تدبیروں پر اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، فی الواقع ان میں سے کوئی بھی ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے اور اس کے حل کی تدبیریں وقت، قوت اور مال کا یہ سارا صرفہ محض ایک زیاں کاری ہے۔ یہ سوالات کہ ایک اقلیت..... اور ایسے ہی دوسرے مسائل غیر مسلموں کے لیے تو ضرور اہم ترین اور مقدّم ترین مسائل ہو سکتے ہیں اور ان کی تمام توجہات اور کوششوں کے مرکز و محور بھی قرار پا سکتے ہیں، مگر ہم مسلمانوں کے لیے یہ بجائے خود مستقل مسائل نہیں ہیں بلکہ محض اس غفلت کے شاخسانے ہیں جو ہم اپنے اصل کام سے برتتے رہے ہیں۔ اگر ہم نے وہ کام کیا ہوتا تو آج اتنے بہت سے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل کا یہ جنگل ہمارے لیے پیدا ہی نہ ہوتا اور اگر اب بھی ہم اس جنگل کو کاٹنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی بجائے اس کام پر اپنی ساری توجہ اور سعی مبذول کر دیں تو دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے پریشان کن مسائل کا یہ جنگل خود بخود صاف ہو جائے گا کیونکہ دنیا کی صفائی اور اصلاح کے ذمہ دار ہم تھے۔ ہم نے اپنا فرضِ منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا تو دنیا خار دار جنگلوں سے بھر گئی اور ان کا سب سے زیادہ پُرخار حصہ ہمارے نصیب میں لکھا گیا......"

("شہادت حق" مولانا مودودی)

اقتباسات کا یہ سلسلہ طویل ہو رہا ہے لیکن "دورِ اول" کی جماعت اسلامی کی تصویر کشی کے لیے ان اقتباسات کا نقل کرنا ناگزیر تھا۔ اس سلسلے میں آخری اقتباس جماعت اسلامی کے اجتماع ٹونک منعقدہ ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کے موقع پر "دو سوال اور ان کا جواب" ہے۔ اس جواب نے اس مسئلے کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

"سوالات: ۱۔ یہ تسلیم ہے کہ مسلم لیگ کے پیش نظر جو پروگرام ہے وہ غیر اسلامی ہے لیکن اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے ناواقف ہے۔ علماء نے انہیں اسلام سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی' وہ اپنے سیاسی لیڈروں کے بتلائے ہوئے راستے کو ہی صراطِ مستقیم اور اسلام کا صحیح راستہ سمجھ رہے ہیں اور غیر مسلم قومیں ان کے وجود کو مٹانے کے لیے سفاکی و خونریزی سے کام لے رہی ہیں۔ ان حالات میں ان کی مظلومی میں جماعت ان کا ساتھ کیوں نہ دے اور غیر مسلموں سے اس مدافعانہ جنگ میں شریک کیوں نہ ہو؟

۲۔ اِس وقت برطانیہ' ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ہندوؤں کا حصہ ہندوؤں کے حوالے کیا جائے اور مسلمانوں کا حصہ مسلمانوں کے حوالے کیا جائے اور دوسری یہ کہ پورے ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے۔ ظاہر ہے اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک پر اور مسلمانوں پر مسلّط ہو جائے گی۔

جواب از امیرِ جماعت: ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے' کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قسم کے حالات دیکھ کر وہ ہم سے اِس وقت یہ مطالبہ کر رہے ہیں' ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور ہر مسئلہ پہلے مسئلے سے شدید تر ہو گا اور آپ

کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک رُخ۔ دوسرا رخ جو اس سے کہیں زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے' یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں' لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہوری حکومت (Secular Democratic State) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (Popular Parliamentary Govt.) نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنّت کے اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے۔

اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کی بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے کام کو چھوڑیئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصہ لیجئے"۔

(روداد جماعت اسلامی)

خلاصۂ مباحث

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اس کا ایک خلاصہ بھی نکال کر سامنے رکھ دوں تاکہ آئندہ کے مباحث میں ان طویل اقتباسات کے نتائج کو بآسانی ذہن میں مستحضر رکھا جا سکے:

اس پوری بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

* اوّل یہ کہ اسلامی نظامِ حکومت اور حکومتِ الٰہیہ کسی معاشرے میں اوپر سے لا کر جڑ دینے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے معاشرے میں اسلامی افکار و نظریات اور اس کے اصولوں کے مطابق ایک ہمہ گیر ذہنی و فکری — اور عملی و اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ جب یہ انقلاب معاشرے میں اس درجہ جڑ پکڑ جاتا ہے کہ کسی اور نظامِ حکومت کا اس کے اوپر مسلّط رہنا ناممکن ہو جائے تو آپ سے آپ ایک فطری طریقے پر نظامِ حکومت میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے —!

* دوم یہ کہ مسلمانوں نے (ہندوستان میں بھی اور بیرونِ ہند بھی) جن مسائل کو اپنے قومی مسائل سمجھ رکھا ہے:

۱۔ وہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے اگر مسلمان اپنا اصل کام یعنی شہادتِ حق اور اقامتِ دین سرانجام دیتے رہتے۔ یہ مسائل اس اصل مسئلے سے مسلمانوں کی غفلت کا شاخسانہ ہیں!

۲۔ اور ان کے حل کے لیے ایک قومی طرز کی تحریک چلانا۔

(الف) نہ اصولاً صحیح ہے۔ اس لیے کہ قوم پرستی سراسر غیر اسلامی اور خلافِ دین چیز ہے!

(ب) اور نہ مفیدِ مطلب۔ اس لیے کہ اس طرح اصل بنائے فساد کے باقی رہنے کے سبب سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور مسائل کے اس جنگل کا اگر ایک گوشہ صاف ہوا تو دوسرا گنجان ہو جائے گا اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔

۳۔ ان کے حل کی صرف ایک صورت اصولاً صحیح اور نتائج کے لحاظ سے متوقع طور پر بار آور ہے کہ مسلمان ہر طرف سے صرفِ نظر کر کے اپنا اصل کام یعنی شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی سعی و جہد شروع کریں اور اس میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

* سوم یہ کہ تحریک مسلم لیگ — اور نظریہ پاکستان:

۱۔ سراسر غیر اسلامی تصورات ہیں۔ اس لیے کہ مسلم لیگ کی تحریک ایک قوم پرست تحریک ہے اور اس کے تحت اگر پاکستان حاصل کر بھی لیا گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک قومی ریاست (National State) تو بن جائے گا لیکن اسلامی ریاست ہرگز نہ ہو گا۔

۲۔ پاکستان کی قومی حکومت کسی طرح بھی — قیامِ نظامِ اسلامی (اقامتِ دین) میں ممد و معاون نہ ہو گی بلکہ غیر مسلمانوں کی قومی حکومت کے مقابلے میں مسلمانوں کی یہ قومی حکومت اس کام کے راستے میں کچھ زیادہ ہی رکاوٹ ثابت ہو گی۔

اور ——

۳۔ اگر پاکستان قائم ہو گیا تب بھی ہمیں نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اسی فطری طریقِ کار پر کام کرنا ہو گا کہ پہلے معاشرے میں ایک بنیادی تبدیلی برپا کریں اور اس کے بعد نظامِ حکومت میں تبدیلی کی توقع کریں۔

صبغۃ اللہ

اب ذرا ایک نظر اس "صبغۃ اللّٰہ" پر بھی ڈال لیجیے جس میں اس اصولی طریقِ کار نے جماعت اسلامی اور اس کے ارکان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو رنگ دیا تھا۔

اس سلسلے میں پہلے دو باتیں نوٹ فرمائی جائیں:

۱۔ ایک یہ کہ جماعت میں داخلہ کی شرائط اور اس کا طریق کیا تھا اور

۲۔ دوسرے یہ کہ آئندہ کے بارے میں پہلے ہی قدم پر کیا تنبیہات کر دی گئی تھیں۔

● پہلی بات کے لیے ملاحظہ ہو "جماعت کی شرائطِ رکنیت" (ماخذ از دستورِ جماعت اسلامی)

"ہر وہ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو' اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کا باشندہ ہو جو عقیدہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے' وہ اس جماعت کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

تشریح: اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ (اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے' بلکہ صرف یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے جو جماعت ہم بنا رہے ہیں اس میں شامل ہونے کے لیے اس قسم کے مسلمان غیر مفید ہیں) اس دائرے میں آنے کے لیے شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو' وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا' اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اور یہ شہادت اس کے طرزِ خیال و طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے کی جرأت کرے' صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے' یا پیدائشی مسلمان ہو اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے"۔

اس طریق پر ادائے شہادت کے بعد ہی ایک شخص اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کر سکتا تھا۔ اس کے بعد اب ذرا ان "تغیرات" کا بھی جائزہ

لے لیا جائے جو از روئے دستور' جماعت اسلامی کے ارکان کو رکن بننے کے بعد (۱) لازماً اور (۲) حسبِ توفیق تدریجاً اپنی زندگیوں میں لانے ضروری تھے:

(۱) "ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکنِ جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:

(الف) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے۔

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے۔

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیتِ فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے (مثلاً سود' شراب' زنا' رقص و سرود' شہادتِ زور' رشوت' خیانت' قمار' قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ) تو اس کو ترک کر دے' بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو' اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا کچھ حصہ شامل ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے۔

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائیداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہلِ حقوق کو ان کے حق پہنچاوے۔ (یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہو گا جہاں حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورتِ دیگر صرف توبہ اور آئندہ کے لیے طرزِ عمل کی اصلاح کافی ہو گی)

(ہ) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر' یا رئیس یا گورنر یا وزیر' یا جج ہو جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے۔

(و) اگر وہ کسی مجلسِ قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ جو مجلس قرآن اور سنتِ رسول کو اساس اور منبعِ قانون تسلیم نہ کرے' اسلام

کی رو سے اس کو انسانی زندگی کے لیے قوانین بنانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اس کی رکنیت قبول کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے۔

(ز) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہوں تو اس کو واپس کرے اور ان وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔ یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا' یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا"۔

(۲) "ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکنِ جماعت کو بتدریج اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیرِ اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت ہو جائے۔

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر' خیال اور عمل کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق ڈھالنا' اپنی زندگی کے مقصد' اپنی پسند اور قدر کے معیار اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا اور اپنی خود سری اور نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابعِ امرِ رب بن جانا۔

(ج) ان تمام رسومِ جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کے خلاف ہوں اور اپنے ظاہر و باطن کو احکامِ شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا۔

(د) ان تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جس کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔

(ہ) فاسقین اور فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین

سے ربط قائم کرنا۔

(و) ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیتِ ربّ العالمین کے قیام واثبات کے سوا کچھ اور ہو۔ (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جاسکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے۔ کوئی رکنِ جماعت انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزو نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا۔

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے سوا ان تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجے پر ہوں مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا"۔

● اور دوسری بات کے لیے ملاحظہ ہو: (اقتباس از "ایک صالح جماعت کی ضرورت")

"لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے..... دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی

ضرورت ہے' اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع ہوں' جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں' جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں' جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اس کو خود چھوڑ دیں۔ پھر ان کو فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی' اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا۔ ان تمام فائدوں' لذّتوں' آسائشوں اور امیدوں کو جو اس نظام سے وابستہ ہوں چھوڑنا ہوگا اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات' تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا' اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے' اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا' قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیٔ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا..... زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے' اپنی محنت سے' اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا' وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی"۔

اس انتباہ کو قبول کر کے — اور مذکورہ بالا طریق پر جو لوگ جماعت اسلامی میں

داخل ہوئے ان کی زندگی میں مندرجہ ذیل چند چیزیں بالکل نمایاں اور واضح تھیں۔ جن لوگوں کو بھی اس زمانے میں جماعت اسلامی کے اراکین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا وہ ان چیزوں کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے اور مخالفین تک نے خواہ لساناً ان باتوں کا اعتراف نہ کیا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل بھی جماعت اسلامی کے اراکین کے خلوص اور عزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دبی دبی زبان سے اس کا اعتراف بھی بارہا مواقع پر ہوا۔

نومسلمانہ جوش کار

سب سے پہلی چیز جماعت اسلامی کے ارکان کا یہ احساس تھا کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے "نومسلم" ہیں۔ انہوں نے اس سے قبل محض ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے اسلام کو اپنا ایک قومی اور نسلی مذہب سمجھا تھا اور اس طرح اب تک وہ بس "نسلی مسلمان" تھے۔ جوں ہی ان پر اسلام کی حقیقت منکشف ہوئی انہوں نے شعوری طور پر نسلی اسلام کو چھوڑ کر حقیقی اسلام کو قبول کیا۔ اس چیز نے ان کے دلوں میں بعینہٖ وہی احساسات و جذبات اجاگر کر دیئے کہ جو ایک نومسلم کے قلب میں پہلی مرتبہ اسلام قبول کرتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے قائد اور مؤسس جناب مودودی صاحب نے "سیاسی کشمکش" حصہ سوم کی ابتدا ہی میں فرمایا تھا:

> "پس میں در حقیقت ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل اور دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔۔۔۔"

تشکیلِ جماعت کے وقت دستورِ جماعت کی منظوری کے بعد جماعت اسلامی میں داخلے کی کیفیت ملاحظہ ہو:

> "اس کے بعد سب سے پہلے مودودی صاحب اٹھے اور کلمۂ شہادت
> اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده و رسولهٗ

کا اعادہ کیا اور کہا کہ لوگو! گواہ رہو کہ میں آج از سرِ نو ایمان لاتا ہوں اور جماعت اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور آپ نے بھی مودودی صاحب کی طرح تجدیدِ ایمان کا اعلان کیا۔ بعد ازاں حاضرین میں سے باری باری کر کے ہر شخص اٹھا' کلمۂ شہادت ادا کیا اور جماعت میں شریک ہوا۔ اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بلکہ بعض لوگوں پر تو روتے روتے رقت طاری ہو گئی تھی۔ قریب قریب ہر شخص کلمہ شہادت ادا کرتے ہوئے ذمہ داری کے احساس سے کانپ رہا تھا۔۔۔۔۔۔"

"روداد جماعت اسلامی" حصہ اول)

اس کے بعد واقعۃً جماعت اسلامی کے ارکان نے ثابت کیا کہ وہ "نو مسلم" ہیں۔ شمولیتِ جماعت کے بعد کی زندگی ان کی پہلی زندگی سے بالکل ممیز اور مختلف تھی۔ ایک بالکل ہی نئی کیفیت اور ایک بالکل ہی نئی شان ان کی زندگی' ان کے افکار' ان کے خیالات' ان کے نظریات' ان کے مشاغل' ان کی دلچسپیوں اور ان کی دوستیوں اور دشمنیوں پر طاری ہو گئی تھی۔ یہ کیفیت ان کی اپنی قبل از جماعت کی زندگی سے بھی بالکل مختلف تھی اور ان کے اردگرد جو لاکھوں کروڑوں "نسلی مسلمان" بس رہے تھے' ان کی کیفیت سے بھی بالکل جدا تھی! یہ پرانے ماحول میں بالکل نئی قسم کے افراد تھے اور ان کا "نیا پن" ان کے آس پاس کا ماحول پوری شدت سے محسوس کرتا تھا۔

تناقض اور نفاق سے بیزاری

ان کی زندگی کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب ان میں "تناقض" اور "نفاق" کا وجود نہیں رہا تھا۔ اور وہ چورنگی اور پچرنگی زندگی تو درکنار دورنگی تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بلکہ "صبغۃ اللہ" میں رنگ کر بالکل یک رنگ ہو گئے تھے۔ وہ جس چیز کے مدعی تھے' پہلے اسے خود اپنی زندگی میں قائم کرتے تھے۔

اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اور بڑے سے بڑا نقصان انہیں گوارا تھا۔

انہیں جو تعلیم دی گئی، وہ یہ تھی:

"قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے پر نکلیں، اس باغی کو مطیع بنایئے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اسکی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہو گی کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں"۔ ("روداد" دوم)

اور

"ہمارا مطالبہ ہر مؤمن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یک سو ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو۔ ہر اس چیز سے کٹ جائے (اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے) جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو اور اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔۔۔۔۔"

(دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات)

اور

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت اور صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔۔۔۔۔ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق اور اوصاف سے بھی آراستہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت اور قابلیت سے ان کو شکست دے"۔

(ایضاً)

اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس جماعت کے کارکنوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ لوگ ایک طرف دین داروں سے بڑھ کر دیندار تھے اور دوسری طرف معاملاتِ دنیا میں بھی پوری طرح منہمک تھے۔ لیکن اس انہماک کی شان یہ تھی کہ اس میں کہیں نہ دروغ گوئی تھی نہ بددیانتی' نہ دھوکا تھا' نہ کینہ بلکہ ایک پاک و صاف زندگی جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو' اس جماعت کے کارکنوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ یہ لوگ اپنے اپنے ماحول میں بالکل اسی طرح چمکتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو۔

اس جماعت کی کیفیت عجیب معجز نما تھی کہ جہاں کوئی شخص اس میں داخل ہوا اس کی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو گیا۔ وہ دہریے اور ملحد جنہیں دین سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو نماز' روزے کا مذاق بطورِ فیشن اڑانے کے عادی ہو گئے تھے' اس جماعت سے متعلق ہوئے تو پابندئ صوم و صلوٰۃ ان کی زندگی کا جزولاینفک ہو گئی۔ وہ چہرے جو ہر روز صبح ہی صبح استرے کی رگڑ کے عادی تھے یکایک داڑھیوں سے مزیّن نظر آنے لگے اور وہ اوقات جو سیر و تفریح اور خوش گپیوں میں صرف ہوتے تھے' اب سنجیدگی کے ساتھ سوچنے' مطالعہ کرنے اور دین کی دعوت کے پھیلانے میں صرف ہونے لگے۔

ان میں سے جس کسی سے کسی کا تعلق قائم ہوا وہ ان کے خلوص' ان کی بے ریا محبت' ان کی بے لاگ دیانت اور ان کی کھری اصول پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جسے بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آیا' اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ معاملات میں نہایت کھرے اور لین دین میں دیانت اور امانت کی کسوٹی پر پورے اترنے والے ہیں۔

انہوں نے جس شریعت کی پابندی کو شعوری طور پر قبول کیا تھا' عملاً اس کی پیروی کر کے دکھائی۔ "حلال اور حرام" کی قیود ان کے لیے بس ازمنۂ قدیم کی باتیں ہی نہ تھیں' عملی زندگی کی ایسی پابندیاں بن گئیں جن میں انہوں نے اپنی زندگیوں کو باندھ کر دکھایا اور اس شان سے باندھ کر دکھایا کہ بے اصولے اور نسلی مسلمانوں کو

اپنی شرمندگی اور خجالت کو چھپانے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہ سوجھا کہ ان پر "دقیانوسیت" اور "ملائیت" کی پھبتیاں کسیں اور حلال اور حرام اور جائز و ناجائز میں فرق کرنے کو ان کی سادہ لوحی پر محمول کریں۔

انہوں نے کہا: "غیر الٰہی حکومت کی ملازمت حرام ہے" ـــــ اور پھر اچھی اچھی ملازمتوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کو ٹھکرا دیا اور اپنے لیے ہزاروں طرح کی معاشی مشکلات پیدا کرنے سے انہیں کوئی چیز اس لیے نہ روک سکی کہ ان کے نزدیک "حق" یہی تھا۔

اس اصول پسندی اور حق پرستی سے جہاں ان کا اخلاقی وقار اور رعب آس پاس کے ماحول پر قائم ہو رہا تھا' وہیں ساتھ ساتھ اس ماحول کے ساتھ تصادم کی بنیاد بھی پڑ رہی تھی۔ پہلے ہی قدم پر ان سے کہہ دیا گیا کہ:

"آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصولوں کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہوں وہ آپ کی پابندِ اصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں ...." ("روداد" دوم)

اور جماعت اسلامی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:

"ان خصوصیات میں سب سے مقدم خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ ماحول میں آپ غربت کا احساس کریں ..... غربت سے میرا مقصد یہ ہے کہ موجودہ فضا میں آپ کو ہر جگہ اجنبیت کا احساس ہو' خاندان میں' سوسائٹی میں' قوم میں آپ کو اپنے ہم درد اور آشنا و ہم خیال و ہم مشرب بہت کم نظر آئیں۔ آپ کو ہر مجلس میں احساس ہو کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں دوسروں کی چاہت اس سے مختلف ہے۔ آپ جو کچھ سوچتے ہیں دوسروں کا فکر اس سے بالکل الگ ہے۔ آپ کا مذاق' آپ کا رجحان' آپ کا خیال اور آپ کا ارادہ ہر چیز دوسروں کے مذاق' رجحان اور خیال و ارادہ سے متباین بلکہ متصادم نظر آئے ....." ("روداد" چہارم)

اور جب واقعتاً یہ کیفیت رونما ہو گئی تو کہا گیا:

"اب تک جہاں جہاں سے اس کشمکش کی اطلاعات آرہی ہیں' وہاں کے لوگوں سے مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آرہی ہیں وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے......"

(روداد-دوم)

یہ تصادم اور کشمکش "اصول پرستی" اور "بے اصولے پن" —اور ع— "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اور "فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ" کے مخالف نظریات کا تصادم تھا اور اس کشمکش میں جماعت اسلامی کا ہر فرد مبتلا تھا۔ پھر یہ کشمکش کوئی محدود کشمکش نہ تھی بلکہ ہر شخص کے گھر اور خاندان سے لے کر پورے معاشرے اور ماحول کے ساتھ تھی۔ ۔

کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثر
اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!

بے پناہ جذبۂ عمل

اس دور کی ایک اور اہم خصوصیت وہ بے پناہ جوشِ کار تھا جو جماعت کے ہر فرد میں پایا جاتا تھا' عام اس سے کہ وہ رکن ہو یا ہمدرد۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں نہ دنیا بنانے کی فکر ہے نہ گھربار جمانے کی۔ نہ جاہ و حشمت کی کوئی طلب ہے نہ مال و دولت کی کوئی حرص۔ انہیں دُھن ہے تو بس ایک بات کی اور سودا ہے تو بس اس کا کہ اللہ کے دین کا چرچا عام ہو' اس کا کلمہ سربلند ہو اور دین حق دنیا میں قائم ہو جائے۔ اسی کے لیے وہ زندہ تھے اور اسی کے لیے مرنا چاہتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا:

"مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے تیسری صفت دل کی لگن ہے...... یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ بھڑک اٹھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہونی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہوتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے یا اتنی جتنی گھر میں غلہ نہ پا کر بھڑکتی

ہے' اور آپ کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے' دل و دماغ کو یک سُو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجئے کہ اپنی ذات کے لیے آپ قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدّوجہد اپنے مقصدِ حیات کے لیے ہو......"

(روداد-دوم)

اور بالکل یہی کیفیت جماعت اسلامی کے ارکان میں نمودار ہوگئی۔ ان کی گرم جوشی اور اپنے مقصدِ حیات کے لیے "فنائیت" اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہیں Fanatic کہا جانے لگا۔ یہ جوشِ کار براہِ راست نتیجہ تھا اس نو مسلمانہ احساس کا جو جماعت کے ارکان کے قلوب میں جاگزیں تھا۔ انہوں نے دین کو شعوری طور پر قبول کیا تھا اور اپنا تن' من' دھن سب کچھ اس کے لیے قربان کرنے کو تیار رہتے۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

انہیں نہ آرام کا خیال تھا نہ چین کا' نہ استراحت انہیں عزیز تھی نہ سیر و تفریح ـــــ نہ تکان کا عذر ان کی طرف سے پیش ہوتا تھا نہ عدیم الفرصتی کا۔ وہ سب "ہمہ وقتی کارکن" تھے جن کے تمام اوقات' تمام صلاحیتیں اور تمام قوتیں اسی ایک کام کے لیے وقف تھیں ماسوائے ان کے اس تھوڑے سے حصّے کے جو معاش اور دنیا کی دوسری ناگزیر ضروریات کے لیے لابدّ منہ تھا۔

اس کام کے لیے ایثار کی بھی انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں کہ جنہیں دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایثار نگاہوں کے سامنے پھر جائے۔ بڑی بڑی ملازمتوں اور تنخواہوں کو انہوں نے چھوڑا۔ بڑے بڑے خوشنما مستقبل (Careers) سے انہوں نے نگاہوں کو پھیرا۔ کاروبار کا ضیاع انہوں نے برداشت کیا اور اپنے مقصد کی لگن اور

اپنے کام کی دُھن میں انہوں نے دنیا کی ہر اس چیز کا نقصان اور زیاں برداشت کیا جس کا نقصان و زیاں ہر انقلابی تحریک کے کارکنوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے ؎۱

اس راہ کی ہر مصیبت کو انہوں نے جھیلا اور ہر تنگی کو برداشت کیا۔ جو مشکل آئی اس کے مقابلے کے لیے تیار ہوئے اور جو الجھن پیش آئی اسے حل کیا۔ کسی مصیبت سے ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور کسی مشکل نے انہیں ہراساں نہ کیا۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جان لو کہ تمہارے عزم کی پختگی اور تمہارے دعوئ ایمان کی سچائی کو آزمایا جائے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۝

یہ لوگ پہلے ہی یہ انتباہ سن چکے تھے کہ:

"اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے ہوں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا ہوگا، قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہئ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے ــــ اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی"۔

("ایک صالح جماعت کی ضرورت" مولانا مودودی)

اور پھر بار بار بھی ان کے کان کھولے جاتے رہے:

"حالات ناسازگار ہوں تو ہوا کریں، دنیا میں کب حق کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ کب ایسا ہوا کہ اہلِ حق چلے ہوں اور چوبداروں نے ان کے آگے ہٹو بچو کی صدائیں بلند کی ہوں۔ حق کی راہ میں طائف اور غارِ ثور، خندق اور احزاب کا ہونا ضروری ہے۔ حق کی خاطر رسول ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، دندانِ مبارک شہید کیے گئے، سر پر اوجھ ڈالی گئی، ہر طرح کی اذیت پہنچائی

؎۱ خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی
(فیض)

گئی۔ بدقسمت ہیں ہمارے وجود اگر ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے۔ حق پرستی
کے راستے میں کب مشکلات حائل نہ تھیں۔۔۔ مشکلات تو اس راہ میں اعوان و
انصار کی حیثیت رکھتی ہیں۔۔۔"

("دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات" مولانا امین احسن اصلاحی)

اور واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان نے اس راہ کی مشکلات اور تکالیف کو "اعوان وانصار" ہی سمجھا!

رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ

ایک اور بہت نمایاں چیز جو اس دورِ اول میں جماعت اسلامی کے ارکان اور متعلقین میں پائی جاتی تھی' وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کی جھلک تھی۔ ان کے درمیان انتہائی گہرا رشتہ اخوت و محبت پایا جاتا تھا۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور ہم مقصدیت نے ان کے اندر ایک ہونے کا ایک بہت گہرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دکھ اور سکھ' مشکلیں اور آسانیاں سب مشترک تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور ایک دوسرے کے رنج و غم اور راحت و مسرت میں برابر کے شریک تھے۔ اس کی تلقین بھی انہیں جماعت کے اکابرین کی طرف سے واضح الفاظ میں ہوئی تھی:

"آپ اپنی ساری وابستگی اور دلچسپی ان لوگوں کے ساتھ بڑھائیں جو اصول و مقاصد میں آپ کے ساتھ متحد ہوں۔ اگر ان کی تعداد کم ہو تو اس کی پروا نہ کیجئے۔ انہی کی رفاقت اور نصرت کی قدر کیجئے۔ اگرچہ وہ آپ کے عزیز نہ ہوں لیکن آپ انہیں عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھئے۔۔۔۔ آپ ہر طرف سے کٹ کر اپنی ساری دلچسپیاں صرف ان ہی کے اندر ڈھونڈیئے۔ یہی آپ کے عزیز ہوں' یہی آپ کے دوست ہوں' یہی آپ کے غمخوار ہوں۔۔۔۔ آپ کا گھرانا اہلِ حق کا گھرانا ہو۔ جن کا رشتہ اہل حق کے ساتھ جتنا ہی ضعیف ہو' آپ کا رشتہ

ان کے ساتھ اتنا ہی ضعیف ہونا چاہیے اور جن کا رشتہ ایمان کے ساتھ جتنا ہی مضبوط ہو' آپ کا رشتہ ان کے ساتھ اتنا ہی مضبوط ہونا چاہیے"۔

(روداد چہارم--- تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

یہ تلقین نہ ہوتی تب بھی یہ ایک فطری بات تھی جس کا پیدا ہونا فکر و نظر کی ہم آہنگی اور منزلِ مقصود اور نصب العین کے اشتراک کے بعد ناگزیر تھا۔ جب اقامتِ دین ان میں سے ہر ایک کا مقصد زندگی تھا اور اسی کے لیے ان میں سے ہر ایک جینے اور مرنے کا تہیّہ کر چکا تھا' تو فطری بات تھی کہ ان میں ان لوگوں سے ذہنی اور قلبی بُعد پیدا ہوتا چلا جاتا جو کسی اور نظریہ اور فکر کے تحت ایک مختلف نصب العین کے لیے کوشاں تھے اور ان لوگوں کے ساتھ قلبی اور روحانی روابط استوار ہوتے جو ان کے شریکِ سفر تھے! اور اس قلبی اور روحانی ربط و تعلق کا جو اس دور میں جماعت کے متعلقین کے مابین پایا جاتا تھا' جس شخص کو بھی مزہ چکھنے کا موقع ملا ہے' وہ اس کی لذّت و حلاوت کو آج تک محسوس کر رہا ہو گا!

عملی نقشہ کار

جماعت اسلامی کے اراکین کی ان چار خصوصیات کے ساتھ ساتھ دورِ اول کی جماعت اسلامی کے طریق کار کی چند ایک خصوصیات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح دورِ ثانی کے ساتھ تقابل میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ میں مندرجہ ذیل چار خصوصیات کو اہم سمجھتا ہوں۔

معیارِ ردّ و قبول

پہلی یہ کہ اس دور میں جماعت اسلامی کو "رائے عامہ" کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس ترک و اختیار اور ردّ و قبول کا صرف ایک معیار تھا اور وہ یہ کہ "حق" کیا ہے اور "ناحق" کیا۔ قوم پرست سیاسی جماعتوں کی قیادتیں عوام کے چشم و

ابرو کے اشاروں پر حرکت کرتی ہیں اور آج کے جمہوری دور میں حدیثِ نبوی ﷺ کہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُم" چاہے اپنے اصلی رنگ میں جلوہ فرما نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ قوم کے قائد اصل میں قوم کے پیرو ہوتے ہیں ـــــ لیکن جماعت اسلامی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو حق ہے اسے بلا خوفِ لَوْمَۃِ لَائِم بیان کرو خواہ اسے عوام قبول کریں یا رد کر دیں اور خواہ اس پر قوم کی ناراضی اور اس کی عداوت ہی مول لینی پڑے۔

جس دور میں جماعت اسلامی اپنے ان افکار و نظریات کو پوری طاقت سے پیش کر رہی تھی' جس کی ایک ہلکی سی جھلک صفحاتِ گزشتہ میں دکھائی گئی ہے' وہ مسلم لیگ کی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور مسلمانانِ ہند تقریباً متفق ہو کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن تھے' لیکن عین اسی وقت جماعت اسلامی "مسلم قومیت" اور "مسلم قوم پرستی" پر بے دھڑک تنقید کر رہی تھی اور "کتمانِ حق" کے جرم سے بچنے کے لیے اظہارِ حق کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کر رہی تھی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی دورِ ثانی کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ ابھی دورِ اول کی خصوصیات باقی تھیں اور دورِ ثانی کے اپنے نقوش گہرے نہ ہوئے تھے' جماعت کی یہ "حق پرستی" اور "حق گوئی و بے باکی" اپنی شان دکھاتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جس جرأت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا' وہ اس کی ایک درخشاں مثال ہے۔ مولانا نے اپنی رائے (قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح تھی یا غلط) جسے وہ "حق" سمجھتے تھے' کھول کر بیان کر دی اور بالکل پروا نہ کی کہ اس کا ردِّ عمل عوام کی طرف سے کیا ہو گا۔ نتیجۃً جماعت کو سخت عوامی لعن طعن اور ملامت و مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" بابت جون ۱۹۴۸ء میں فرمایا:

"میرے لیے کسی مسئلہ پر رائے قائم کرنے اور ظاہر کرنے میں یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ لوگوں کے جذبات اس معاملہ میں کیا ہیں

اور لوگ کس چیز کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ میرے سامنے اصل سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس معاملے میں خدا اور رسول ؐ کی ہدایت کیا ہے اور خدا کو کیا چیز پسند اور کیا ناپسند ہے۔ پھر جب مجھے تحقیق سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنّت کے مطابق فلاں طرزِ عمل صحیح ہے اور اسی میں خدا کی خوشنودی ہے تو میں خود اس کو اختیار کرتا ہوں اور دوسروں کو اسی کی پیروی کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس تحقیق سے اگر کوئی چیز مجھے ہٹا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول ؐ کی سنت ہی سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ میری تحقیق غلط ہے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی رائے پر اصرار کرنا میں گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر قرآن و سنت میں میری رائے کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ بات میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی کہ فلاں معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات نازک ہیں یا فلاں رائے کو مسلمان ناپسند کرتے ہیں……"

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ محض ایک دعویٰ ہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے دورِ اوّل کی ایک نمایاں خصوصیت تھی!

تقدیم و تاخیر کا اصول

دُوسری یہ کہ اس کے کام میں emphasis اور تقدیم و تاخیر کی ترتیب یہ تھی۔

- سب سے مقدم اور سب سے اہم : ذہنی، فکری اور علمی انقلاب
- اس کے بعد : عملی و اخلاقی تبدیلی
- اور مؤخر ترین : رفاہِ عامہ اور خدمتِ خلق کے کام

اور اصولاً ایک "انقلابی جماعت" کے طریق کار میں یہی ترتیب ہونی بھی چاہیے۔

علمی انقلاب

جماعت کے نزدیک سب سے زیادہ ضروری اور مقدّم کام علمی انقلاب کا تھا اور اس دور میں جماعت کی اکثر و بیشتر مساعی اسی کام کے لیے صرف ہوئیں۔ جماعت یہ سمجھتی تھی اور یہ سولہ آنے صحیح بھی تھا کہ اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا اس وقت تک جنّت الحمقیٰ میں رہنے کے مترادف ہے جب تک موجودہ دور کے گمراہ کن نظریات، افکار اور فلسفے کا مقابلہ ایک زبردست اسلامی علمی تحریک کے ذریعے کر کے انہیں شکست نہ دے دی جائے۔ چنانچہ جماعت اپنے مقدور بھر اس "علمی انقلاب" کے لیے سعی و جُہد کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی مسلسل ایسے نظامِ تعلیم کے قیام کے لیے کوشاں تھی اور اس طرح کی تعلیمی تجاویز اور Schemes پر سوچ و بچار کر رہی تھی جو اس علمی تحریک کے لیے محققین اور ResearchScholars کی ایک جمیعت فراہم کر کے دے سکے ـــــــ بہر حال یہ کام جماعت کے نزدیک اہم ترین اور مقدّم ترین تھا۔

عملی و اخلاقی انقلاب

دوسرا اہم اور لازمی کام جماعت کے نزدیک عملی و اخلاقی انقلاب تھا۔ علمی انقلاب کے لیے سعی کے بعد جس کام پر جماعت کی سب سے زیادہ مساعی صرف ہو رہی تھیں، وہ یہی اخلاقی اصلاح کا کام ہے۔

لیکن اس اخلاقی اصلاح کے لیے بھی جماعت اسلامی نے اپنا ایک مخصوص طریقِ کار وضع کیا تھا۔

اس کے نزدیک اصلاحی انجمنیں اور ادارے بنا کر کچھ سطحی تدابیر سے اصلاحِ اخلاق کا کام کرنے کی کوشش کرنا حماقتِ محض تھا۔ وہ یہ جانتی تھی اور بالکل صحیح طور پر جانتی تھی کہ انسانی اخلاق نظامِ انسانی میں کوئی علیحدہ یا سطحی چیز نہیں ہوتے بلکہ ان کی جڑیں انسان کے نظریات اور افکار اور اس کے عقائد و تصورات میں گہری اتری ہوئی

ہوتی ہیں اور ان میں انقلاب برپا کیے بغیر انسان کے اخلاقی رویّہ میں تبدیلی کی توقع رکھنا عبث اور اس کی کوشش کرنا وقت اور قوت کا ضیاع ہے۔ (ملاحظہ ہو "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" مصنفہ مولانا مودودی) لہٰذا اس نے اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لیے اس قسم کی سطحی تدابیر اور آسان تجاویز کو استعمال کرنے کی غلطی نہ کی۔ بلکہ پہلے افکار و نظریات کے انقلاب (بذریعہ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ آیٰتِہٖ) اور اس کے بعد تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق (یعنی یُزَکِّیْہِمْ) کے طریق کار کو پیش نظر رکھا۔

رفاہِ عامّہ کے کاموں کی حیثیت

رہا رفاہِ عامہ اور خدمتِ خلق کے کاموں کا مسئلہ تو اس معاملے میں اس دور کی جماعت اسلامی تقریباً خاموش معلوم ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر ان کاموں کے کرنے کی تلقین و ترغیب تو چند ایک جگہوں پر نظر آتی ہے لیکن اس کے لیے کسی اجتماعی سعی و منظم کام کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خصوصاً تعلیمِ بالغاں کی تلقین اور اس پر زوردار ترغیب کئی مقامات پر ملتی ہے لیکن اس کے لیے بھی کوئی منظم کوشش غالباً نہیں کی گئی۔

اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر بالکل فطری اور صحیح ہے۔ رفاہِ عامہ اور خدمتِ خلق کے کام "سیاسی جماعتوں" کے کرنے کے ہوتے ہیں نہ کہ "انقلابی جماعتوں" کے۔ سیاسی جماعتوں کے لیے جن کے پیش نظر ایک خاص نظام میں 'اس نظام کو اصولاً حق سمجھتے ہوئے' صرف اس کے انتظام کرنے والے ہاتھوں کو بدلنا ہوتا ہے' بالکل صحیح ہے کہ وہ اس قسم کے کام کرکے عوام میں مقبولیت حاصل کریں اور اپنے آپ کو عوام کا سچا خادم اور ہمدرد ثابت کریں تاکہ وہ ان کے ہاتھ میں اپنے اقتدار کی باگیں تھما دیں' لیکن انقلابی جماعت کے پاس کہ جس کے پیش نظر اس نظام ہی کو بدلنا ہو اس قسم کے [illegible] کے لیے نہ وقت ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کام اس کے لیے کچھ مفید ہوتے ہیں — اس کے نقطۂ نظر سے تو عوام کی سب سے بڑی "خدمت" بھی یہی ہوتی ہے کہ جس چیز کو اس نے "حق" پایا ہے اسے ان کے سامنے واضح کردے — یہی وجہ ہے کہ ان

کاموں میں سے کسی کام کو جماعت نے اس دور میں در خورِ اعتناء سمجھا تو وہ صرف تعلیم بالغاں کا کام تھا جس کے ذریعے دراصل اپنے پیش نظر علمی و اخلاقی انقلاب ہی کے لیے راہیں ہموار کرنا تھا۔ اس کے سوا کسی اور کام کی طرف جماعت نے من حیث الجماعت توجہ نہ کی!

جماعت سے وابستگی کی شکلیں

تیسری یہ کہ اس دور میں جماعت اسلامی نے اپنے ساتھ تعلق کی دو شکلوں یعنی رکنیت اور ہمدردی و اتفاق میں سے Emphasis جس پر دیا وہ رکنیت تھی!— اور اس پر Emphasis اس قدر زیادہ تھا کہ صرف اسی کو واحد صحیح شکل کی حیثیت سے بیان کیا جاتا تھا۔ اُس وقت اصل کوشش اس بات کی ہوتی تھی کہ ہر شخص جماعت کا رُکن بنے اور تن من دھن کے ساتھ (بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ) جماعت کے اندر شامل ہو جائے۔ ہمدردی کا شعبہ رکھا بھی گیا تھا تو اس اصل شعبے کی ابتدا اور دیباچے کے طور پر، نہ کہ اس کے مستقل فوائد کے پیش نظر۔

جماعت کا کہنا یہ تھا— کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ حق ہے اور وہی حق ہے— اور جو شخص اسے قبول کرے اس کا فرض ہے کہ ہمہ تن اسی کا ہو کر رہے اور اپنی کسی چیز کو اس سے آزاد نہ رکھے۔(اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً)— پہلے اپنی زندگی میں اس "حق" کو عملاً قائم کرے اور پھر اس کو پوری دنیا میں قائم کرنے (اقامتِ دین) کے لیے اپنی جان، مال، صلاحیت، قوت اور وقت کو وقف کر دے۔ اس حق کو حق مان کر پھر اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا یا اس کا اظہار کر دینا— یا اس کے ساتھ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تعاون کر دینا ایک فضول اور لاحاصل بات ہے۔

روداد چہارم میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تقریر میں "ہمدردانِ جماعت سے خطاب"— کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہم نے جماعت کے ساتھ ہمدردوں کا ایک شعبہ محض بعض وقتی اور

عارضی مصالح کے لیے رکھا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے ایسے لوگوں کے لیے بھی یہ شعبہ مأمن کا کام دے رہا ہے کہ جن کی اصل جگہ جماعت کے نظام کے اندر تھی نہ کہ ہمدردوں کی صفوں میں------اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض صرف اس طرح ادا نہیں ہو سکتے کہ آپ اس جماعت کے ساتھ فی الجملہ ہمدردی رکھتے ہوں جو ان فرائض کو پورا کرنے کے لیے اٹھی ہے بلکہ آج ان کے ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ اپنا تمام سرمایۂ زندگی اس جماعت کو برپا کرنے میں لگا دیں جو اس مقصد کے لیے اٹھے---- مجرد دعا گوئی اور اظہارِ ہمدردی کو ادائے فرض کی ایک قسم سمجھ لینا اور اس پر قانع ہو جانا سخت پست ہمتی اور کمزوری کی بات ہے---- یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہم اس مسئلہ پر غور کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمدردوں کا ایک مستقل شعبہ رکھنا کچھ مفید ہے یا نہیں.... ہم آپ کے سامنے اللہ کا دین پیش کر رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ آپ کی زندگی کا صرف ایک جزو نہیں بلکہ یہی کل ہے۔ اگر ہماری بات میں کوئی غلطی اور ہمارے استدلال میں کوئی خامی ہے تو آپ اس کو واضح کر دیجیے تاکہ ہم اس غلطی کی اصلاح کر لیں اور اس خامی کو دور کر دیں لیکن اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حق وہی ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آپ پر اللہ کی حجت تمام کر دی اور آپ کے لیے حق سے اعراض یا انحراف کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے صحیح راہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ اس حق کو آپ مردانہ وار قبول کریں جو آپ پر واضح ہو چکا ہے------"

نظامِ مالیات

آخری اور اہم خصوصیت اس کا مخصوص نظامِ مالیات تھا۔ اس سلسلے میں اس نے:

اولاً: عوامی چندوں سے اپنے دامن کو بالکل پاک رکھا اور ان تمام ذرائع کو

قطعاً استعمال نہ کیا جو اس زمانے میں (اور آج بھی) مختلف سیاسی و دینی جماعتیں فراہمیٔ زر کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

ثانیاً: فراہمیٔ زر کا اصل الاصول یہ تھا کہ جن لوگوں کو جماعت اور اس کے کام سے اتفاق اور دلچسپی نہیں ہے، ان سے مالی اعانت طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان سے تو ہمارا اتمام تر خطاب یہ ہے کہ وہ اس حق کو قبول کریں جو ہم پیش کر رہے ہیں ـــــ اس کام کے اخراجات کا بوجھ ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے کہ جو اس کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اسے اپنا کام سمجھتے ہوں اور انہیں چاہیے کہ وہ بلا کسی کے کہے اور مانگے از خود دیں اور صرف رضائے رب کے لیے دیں ـــــ نہ ان کا نام کہیں شائع ہوگا، نہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے پاس جا جا کر اعانت کی اپیل کی جائے گی۔

ثالثاً: جماعت کا بجٹ "نیچے سے اوپر کی طرف" چلتا تھا۔ یعنی جتنی رقوم مقامی جماعتوں کو حاصل ہوتی تھیں، ان کا ایک حصہ وہ اپنے لیے رکھ کر باقی حلقہ کو ارسال کر دیتی تھیں اور حلقہ جات اپنے اپنے حصص رکھ کر بقیہ مرکز کو ارسال کر دیتے تھے۔ رقوم "اوپر سے نیچے کی طرف" عائد نہ کی جاتی تھیں ـــــ اور

رابعاً: جماعت کے "بیت المال" کے بارے میں امراء اور دوسرے ذمہ دار حضرات کے احساسات انتہائی نازک تھے اور وہ اس کے ایک ایک پیسے کی حفاظت پر اپنی اخروی نجات کو منحصر خیال کرتے تھے۔

خاتمۂ کلام

ان نقوش پر کہ جو صفحاتِ گزشتہ میں ثبت کیے گئے ہیں' سرسری طور پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا یہ دورِ اول کم از کم ظاہری اعتبار سے بالکل وہی نقشہ پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کا خاصہ رہا ہے۔ بالکل وہی افکار و نظریات و عقائد ـــــ اور بعینہٖ وہی دعوت پیش کی گئی کہ جو انبیاءِ کرام پیش کرتے آئے ہیں اور بہت حد تک وہی نصب العین اختیار کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریق کار اختیار کیا گیا کہ جو ان کی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ ان دونوں کے نقوش میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور بنظرِ ظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی' اس لیے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہرحال موجود تھیں' جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے بھی اپنی محدود بصیرت کے مطابق کلام کرنا ہے' لیکن جو بات ایک گونہ اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنی نوعیت' اپنے بنیادی افکار و خیالات' اپنی دعوت اور اپنے طریق کار اور اس میں ترتیب اور تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے' تھی بہرحال اسلام کے اصولوں کے مطابق اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کے نقش قدم پر۔

تحریک کی ابتداء ہی سے اس کے مؤسس اور قائد کو اس کی نوعیت کا پورا پورا احساس تھا۔ ان کے نزدیک یہ تحریک جزوی اصلاح کی علمبردار نہ تھی اور نہ ہی اس کی طرف سے "حق" صرف جزءً ا پیش ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس یہ پورے حق کو پیش کر

رہی تھی اور اس اعتبار سے انبیاءِ کرام کی تحریکوں کی وارث اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کی جانشین تھی۔ لہٰذا اس کا معاملہ دنیا کی دوسری تمام تحریکوں سے مختلف تھا۔ مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں ایک "انتباہ" ملاحظہ ہو:

"اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا' جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے' کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں' ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے' مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو جو اُمّتِ مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے' یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دُو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دوٹوک فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اٹھنے تک دیکھتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا روش اختیار کرتے ہیں لیکن بہرحال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخر کار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے' لیکن مسلمان اگر حق سے منہ موڑیں اور اپنے مقصدِ وجود کی طرف صریح دعوت کو سن کر الٹے پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے' اس لیے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لیے تو آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے' رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے' اس کا علم صرف اللہ کو ہے' ممکن ہے کہ ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لیے مقدر ہوں' لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا' اکابر امت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا یا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اتر آنا' اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکتے اور جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا' میرے نزدیک ایک نہایت بری علامت ہے اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے"۔

("روداد" دوم)

یہ ایک بہت بڑی بات تھی کہ جو مولانا مودودی نے کہی' لیکن شاید یہ کہا جا سکے کہ "جماعت اسلامی" کے مؤسس و قائد کو اس کے کہنے کا حق حاصل تھا!!

دَورِ ثانی

اور

اُس کی خُصُوصیات

ع

"تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہُوا"

تحریکِ جماعت اسلامی کا دورِ ثانی ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے شروع ہوتا ہے اور تاحال جاری ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک جاری رہے۔

تقسیم ہند کے ساتھ ہی جماعت اسلامی ہند بھی دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی اور ان دونوں کے نظم کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور آزاد کر دیا گیا۔

● ہندوستان میں حالات چونکہ نوعیت کے اعتبار سے بالکل ویسے ہی تھے جیسے تقسیم ہند سے قبل، لہٰذا وہاں کی جماعت انہی اصولوں اور طریق کار پر کام کرتی رہی جن پر اس سے قبل کر رہی تھی ــــ لیکن اس کے لیے کام کے راستے کچھ تو اس تلخی نے بند کر دیئے تھے جو ایک رُبع صدی کی اس شدید قومی کشمکش اور کم و بیش دس سالوں کے اس شدید قومی تصادم سے پیدا ہوئی تھی جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جاری رہا۔ اس جنگ نے فریقین کے جذبات کو اس درجہ برانگیختہ کر دیا تھا کہ مخالف کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کی بات ایک دوسرے کے لیے سننی ناممکن ہو گئی تھی۔ اور رہی سہی کسر کو جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم کی پالیسی نے پورا کر دیا۔ اس پالیسی کی تفاصیل تو آگے آئیں گی، مجملاً صرف اس قدر عرض کر دیا جائے کہ جب اس نے اپنے آپ کو ایک اصولی اسلامی جماعت کی بجائے ایک قوم پرست گروہ کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا تو جماعت اسلامی ہند کے لیے بھی نام کے اشتراک اور قبل از تقسیم کے پیدا شدہ لٹریچر کے اشتراک کے باعث اپنی پوزیشن کو واضح رکھنا مشکل ہو گیا۔

بہرحال جماعت اسلامی ہند اگرچہ اپنے سابقہ نظریات اور طریق کار کے ساتھ صفحہ ہستی پر موجود ہے لیکن اس کی رفتارِ کار و توسیع مایوس کن حد تک کم ہے اور اب مجملاً "جماعت اسلامی" کی حیثیت سے دنیا جس جماعت کو مراد لیتی ہے وہ "جماعتِ

اسلامی پاکستان" ہے! ہندوستان میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ایک محدود حلقہ "جماعت اسلامی" سے مراد جماعت اسلامی ہند لے لیتا ہو لیکن ہندوستان کے غیر مسلم عوام — اور بیرونِ ہند و پاک پوری دنیا میں "جماعت اسلامی" کے نام سے جو جماعت مراد لی جاتی ہے وہ صرف "جماعت اسلامی پاکستان" ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ تقسیمِ ہند کے بعد تیزی کے ساتھ وسعت پذیر جماعت اسلامی پاکستان ہی ہوئی۔ اور اس لیے بھی کہ اس کے مؤسس اور اس کے اہلِ قلم حضرات کا ایک بہت بڑا گروہ بھی پاکستان ہی کی جماعت کے حصے میں آئے۔

● اور اس جماعت نے اپنے دورِ ثانی میں جو طرز عمل اختیار کیا اس نے اس کی ہیئت اور نوعیت ہی کو سرے سے بدل کر رکھ دیا۔ مولانا مودودی صاحب نے اسے اسی تحریک کا مرحلۂ توسیع و عملی اقدام قرار دیا ہے کہ جو ۱۹۴۱ء میں شروع ہوئی تھی لیکن میری رائے میں اس دور کا طریق کار اور طرز عمل پہلے دور کے طریق سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان دو ادوار کو ایک ہی تحریک کے دو مراحل کہنا ناممکن ہے:

"اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم" میں مولانا مودودی صاحب نے فرمایا تھا:

"حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعیات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بدھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالمِ انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ اور مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کُلّی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹیفک تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا لیکن اول یوم پیدائش ہی سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکی تحریک آگے بڑھی ہے اور

قومیتوں کی حدود کو توڑ کر جہانی تصوّر کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی۔"

اور پھر حاشیہ میں تحریر فرمایا:

"بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں۔ اسٹالن اور اس کے طرزِ عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے"۔

بعینہٖ یہی کیفیت جماعت اسلامی پاکستان کے ساتھ پیش آئی۔ وہ ایک خالص اصولی اور بین الاقوامی' بلکہ انسانی بنیادوں پر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی اور ابتداء میں اس نے نسلی' لسانی' وطنی اور لونی قومیتیں تو ایک طرف خود "مسلم قوم پرستی" جو ایک قومیت ہونے کے باوجود بین الاقوامیت کا رنگ بہرحال رکھتی تھی' کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ لیکن اس کی یہ شان زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال قائم رہ سکی۔ اس کے بعد اس نے بھی پاکستان میں آکر مسلم قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وائے ع

"خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

اصولی اعتبار سے طریق کار میں تو یہ فرق ۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ اس کے بیج تقسیم سے کچھ عرصہ قبل ہی بوئے جا چکے تھے' لیکن اس کی شبیہ میں اس نئے طریق کار اور نئی پالیسی کے نقوش کو اجاگر اور نمایاں ہونے میں کچھ عرصہ لگا۔ اس عبوری دور میں اس کی وہی خصوصیات جو اس نے اپنے دورِ اول میں پیدا کی تھیں' نمایاں رہیں لیکن آہستہ آہستہ "رنگِ قدیم" پھیکا اور ماند پڑتا چلا گیا اور "رنگِ جدید" غالب آتا چلا گیا ___ تاآنکہ آج اس کے نقوش ایک خالص قومی جماعت کی نقشہ کشی کرتے ہیں اور اس میں ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش بس

"نقوشِ ماضی" کی حیثیت سے ان اوراق میں دفن ہو کر رہ گئے ہیں' جن پر تقسیمِ ہند کے قبل کا لٹریچر مشتمل ہے۔

اس دورِ ثانی میں جماعت اسلامی کے نقوش یہ ہیں:

بنائے استدلال 'نسلی اسلام

اس دور کے طریقِ کار کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ اس میں "نسلی" اور "اصلی" اور "ظاہری" اور "حقیقی" اسلام کی تمیز ترک کر کے لوگوں کے ظاہری اسلام کو بطورِ اصلِ موضوعہ تسلیم کر کے استدلال شروع کیا گیا۔ جس شدت سے اور جس طرح لگی لپٹی رکھے بغیر دورِ اول میں "رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی" اس مسلمان قوم کا تجزیہ کیا گیا تھا' اسی قدر اطمینان کے ساتھ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دورِ ثانی میں اس پوری قوم کو "مسلمان" فرض کر کے استدلال کی بنا رکھی گئی۔ اس پورے دورِ ثانی میں آپ کو

> "ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں' ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔"

کی قسم کی ایک بات بھی نہ ملے گی۔ یہاں اب پوری شدت کے ساتھ جو استدلال سامنے آتا ہے' وہ کچھ اس طرح کا ہے.... "جب ہم مسلمان ہیں تو لازم ہے کہ ہماری حکومت مسلمان ہو"۔ اور "چونکہ پاکستان میں غالب اکثریت 'مسلمانوں' کی ہے' لہٰذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی دستور نافذ کیا جائے" اور اب اصل زور (EMPHASIS) اس بات پر نہ رہا کہ مسلمانوں کے عقائد' ان کے افکار' ان کے کردار اور ان کے اخلاق کا تجزیہ کر کے اس میں اسلامی اور غیر اسلامی آمیزش کو واضح کیا جاتا اور مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بننے کی تلقین کی جاتی' بلکہ اصل زور اس بات پر صرف کیا جانے لگا کہ

"جب ہم مسلمان ہیں" ----تو لازم ہے کہ ہماری ریاست اور حکومت کا اوپر کا ڈھانچہ اسلام کے مطابق تبدیل کر دیا جائے۔

مسلمانوں کا اسلام کے ساتھ لگاؤ جس کی حیثیت اس سے قبل صرف ان کے ایک "آبائی مذہب" ہونے کے ساتھ ان کے جذباتی لگاؤ کی سمجھی جاتی تھی' اب اس طرح پیش کیا جانے لگا گویا کہ یہ قوم اسلام ہی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا چاہتی ہے اور اس کی دلی خواہش ہے کہ اس کے تمام امور' خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں' خواہ اجتماعی سے' اسلام ہی کی منشا کے مطابق طے پائیں۔

ملاحظہ ہو:

"دوسری صورت یہ ہے کہ ہم انفرادی اور قومی زندگی کے لیے اس راہ کا انتخاب کر لیں' جو قرآن اور سنتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دکھائی ہے۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلم آبادی کے کم از کم ۹۹۹ فی ہزار باشندے چاہتے ہیں....."

(مسلمانوں کا ماضی و حال اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل)

"مطالبہ نظامِ اسلامی" کے مقدمات میں کہا گیا:

"یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی جگہ مسلم ہو لیکن جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔"

گویا کہ اس قوم کے ایک ایک فرد کا "مسلم" ہونا بطور اصلِ موضوعہ کے تسلیم! اور اس چیز کی لے یہاں تک بڑھی کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب جماعت اور اس کے اکابرین کو پورے ماحول میں خرابی بس صرف ایک "برسرِ اقتدار طبقہ" میں نظر آتی تھی۔ خرابیوں اور برائیوں کا مجسمہ اگر تھے تو بس صرف اس طبقہ کے لوگ—— رہی باقی مسلمان قوم تو اس کے دل میں تو گویا مؤمنانہ اور مسلمانہ جذبات موجزن تھے اور یہ آرزو جاگزیں تھی کہ کسی طرح پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ وہ "انفرادی اور نجی" اعتبار سے تو مسلمان تھی ہی' اب کسر صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ اس کی

حکومت کے ماحول اور اس کے نظامِ حکومت و سیاست اور دستور و قانون کو اسلام کے مطابق بدل دیا جائے۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

اگرچہ مسلمان عوام کی اخلاقی و دینی پستی پر اس کے بعد کے دور میں بھی تنقید ہوتی رہی اور ان کے مختلف طبقات کی خامیوں کو گنوایا جاتا رہا لیکن اصل سوال EMPHASIS کا ہے اور وہ اب بجائے اس کے کہ "مسلمانو! تم حقیقتِ اسلام سے دُور ہو' اس بُعد کو ختم کرو!" اس پر تھا کہ "جب ہم مسلمان ہیں تو چاہیے کہ ہماری حکومت بھی مسلمان ہو——!"

غیر مسلموں سے اپیل کا خاتمہ

ساتھ ہی اس تحریک کی اپیل اور دعوت غیر مسلموں کے لیے ختم ہو گئی۔ بعدِ تقسیم کے پورے لٹریچر میں آپ کو سرے سے یہ بات کہیں نہ ملے گی کہ یہ ایک بین الاقوامی تحریک ہے' جس کا تخاطب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب سے ہے! اوو رِاول ہی کے کچھ سکہ بند فقرے جن کو ادا کرنے کی زبانیں چھ سات سال کے عرصہ میں عادی ہو گئی تھیں' عادتاً تو کہیں کہیں ضرور دہرائے ہوئے ملتے ہیں لیکن ایک تحریک کی حیثیت سے دعوت کا اپیل اب صرف مسلمانوں سے رہ گیا تھا (بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ دعوت تو مسلمانوں کو بھی نہ تھی' اب تو تمام تر خطاب "برسرِ اقتدار گروہ" سے تھا)

اب غیر مسلموں کے لیے کسی اتمامِ حُجت کی سرے سے ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں جوں کے توں "کافر" تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پہلے انگریزوں' پارسیوں' ہندوؤں اور سکھوں تک کو کافر کہنا (باعتبارِ حقیقت' نہ کہ باعتبارِ قانون) صحیح نہ تھا اور اب ان لوگوں کی تکفیر کے لیے بھی سعی و جہد میں باقاعدہ حصہ لیا گیا کہ جو کم از کم اہلِ قبلہ تھے اور جن کو خود اپنے اسلام پر اصرار تھا۔

انٹی قادیانی تحریک میں جماعت اسلامی کا حصہ اس دورِ ثانی کی خصوصیات کا ایک مکمل مجموعہ ہونے کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے لہذا اس پر مفصل گفتگو تو بعد میں ہوگی --- یہاں صرف اس قدر وضاحت مطلوب ہے کہ دورِ اول میں جماعت اسلامی اتمامِ حجت سے قبل "انگریزوں، سکھوں، ہندوؤں اور پارسیوں" تک کو کافر کہنے میں احتیاط کرتی تھی لیکن دورِ ثانی میں اس کا مزاج اور مذاق بالکل عوامی سطح پر آ گیا۔

قومی جماعت

جس طرح دورِ اول کی جماعت اسلامی کی خصوصیات اول و دوم نے اسے بالکل "اصولی اسلامی تحریک" کی حیثیت دی تھی، اسی طرح دورِ ثانی کی مندرجہ بالا خصوصیات اول و دوم نے اس دور کی جماعت کو بالکل ایک "قومی جماعت" کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا۔ وہی لفظ قوم جو پہلے اس لیے متروک ہو گیا تھا کہ چاہے اپنی اصل کے اعتبار سے اس میں فی الواقع کوئی قباحت نہ ہو، لیکن اس کے ساتھ عرصۂ دراز کے استعمال سے غیر اسلامی تصورات لازماً وابستہ ہو گئے تھے (بلکہ مولانا نے تو ثابت کیا تھا کہ یہ لفظ کسی طرح بھی خالص اسلامی ہیئتِ اجتماعی کے لیے نہیں بولا جا سکتا۔ اس کے لیے تو جماعت، حزب اور اُمت ہی کے تین الفاظ ہیں) [۲۹] اب بکثرت اور پورے اطمینان کے ساتھ تقریروں اور تحریروں میں استعمال ہونے لگا۔

اس دور کی "خشتِ اول" کی حیثیت رکھنے والی تقریر "مطالبۂ نظامِ اسلامی" کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

> "حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گزر رہے ہیں، ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اِس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوئے

---

[۲۹] ملاحظہ ہوں اقتباسات مندرجہ بر صفحہ ۶۰ - ۶۲

ہیں' ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بحیثیتِ قوم ہم کریں گے' وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر' بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔"

اور اس کے بعد جس اطمینان کے ساتھ تحریروں اور تقریروں میں ہمارے قومی مسائل' ہمارے قومی رجحانات' ہماری قومی خواہش' ہمارے قومی جذبات' ہماری قومی روایات' ہماری قومی تہذیب اور ہمارے قومی تمدن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' ان کو جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل میں جانا لا حاصل ہے۔ البتہ اس موقع پر ایک اقتباس دیئے بغیر گزر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ملاحظہ ہو "اشارات" ترجمان القرآن اگست ۴۸ء کا پہلا پیراگراف:

"مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دو چار ہیں' ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیتِ مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے' جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل رکھا جائے۔۔۔۔ بہر حال قوم کی خیر خواہی کا اس میں شائبہ بھی نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے۔۔۔۔"

گویا کہ مسلمانوں کے قومی CAUSE کی CHAMPION اب جماعت اسلامی تھی ع

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں"۔

پھر اگلے ماہ کے "ترجمان" کے اشارات کا اٹھان ملاحظہ ہو:

"اس مہینے مسلمانوں کو دو ایسے زبردست حادثے پیش آئے ہیں جنہوں نے ان کی قومی زندگی کو صدمۂ عظیم پہنچایا ہے۔"

اس موقع پر ذرا اوراق الٹ کر دورِ اوّل کی تحریروں کے وہ اقتباس ملاحظہ فرما لیجئے جو ص ۵۹ سے ص ۶۲ تک درج ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو

بیک وقت دیکھنے سے پوری طرح اندازہ ہو گا کہ یہ فرق اور امتیاز صرف لفظی نہیں ہے' بلکہ اس سے پوری تحریک کی نوعیت میں کس قدر عظیم الشان فرق واقع ہو گیا ہے۔ جس تحریک کی ابتدا خالص اسلامی اور اصولی تحریک کی حیثیت سے ہوئی ہو' اس کا اس طرح ایک قومی جماعت میں تبدیل ہو جانا معمولی فرق نہیں' بلکہ بنیادی تبدیلی ہے۔

نصب العین

جماعت اسلامی کا نصب العین اگرچہ اس دورِ ثانی میں بھی وہی رہا' جو دورِ اول میں تھا لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہ ہو گا کہ اس تبدیلی سے نصب العین بالکل متاثر نہیں ہوا۔ اگرچہ آج بھی جماعت کے دستور میں نصب العین کی دفعہ کے تحت تقریباً وہی الفاظ مرقوم ہیں جو دورِ اول میں تھے لیکن تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ الفاظ جوں کے توں رہے ہیں لیکن ان کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ یہی مسلمان کا لفظ آج سے ہزار بارہ سو سال قبل اپنے اندر جو مفہوم رکھتا تھا' کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی اس کے باوجود کہ یہ لفظ اسی طرح بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے..... تاہم نصب العین کے مفہوم میں تبدیلی ایسی بنیادی اور نمایاں نہیں بلکہ خفی اور دوسری تبدیلیوں کی نسبت کسی قدر کم ہے۔

جماعت اسلامی کا نصب العین فی الحقیقت دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک دنیا میں جماعت کی سعی و جہد کا مقصود..... اقامتِ دین' اور دوسرے جماعت کے کارکنوں کو اس سے فی الواقع مطلوب..... رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی۔

یہ دونوں باتیں جہاں تک ان کے الفاظ کا تعلق ہے' جماعت کے کارکنوں کو ازبر ہیں اور اگر آپ کسی سے سوال کریں تو وہ بلا توقف و تاخیر فوراً یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے بیان کر دے گا' لیکن ہر صاحب نظر شخص جسے جماعت کے اندر عملاً کام کرنے اور اس کے کارکنوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہو اور جو ذرا حقیقت

بنی کے ساتھ سطح سے ذرا نیچے اتر کر جائزہ لے' اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہ رہے گی کہ رفتہ رفتہ یہ الفاظ اپنی معنویت کھوتے چلے جارہے ہیں اور اس نصب العین کے حقیقی نقوش جماعت کے کارکنوں کے دل و دماغ میں پھیکے پڑتے چلے جارہے ہیں اور دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہونا بالکل فطری اور ناگزیر بھی تھا۔

خصوصاً نصب العین کے دوسرے جزو کے بارے میں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اتنی "پاکیزگی" بھی اب قطعاً موجود نہیں ہے جو دورِ اول میں تھی اور اس میں کہیں کم اور کہیں زیادہ کچھ اور چیزوں کی آمیزش اور ملاوٹ ہو گئی ہے اور جوں جوں یہ دور گزرتا جارہا ہے' اس آمیزش میں "اخروی نجات" کا تناسب کم اور "دوسری چیزوں" کا تناسب زیادہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ جسے میں ناقابل تردید شہادتوں اور ناقابل انکار دلائل سے ثابت کرسکوں' البتہ یہ میرا ایک گہرا احساس ہے جو جماعت کے کارکنوں کے براہ راست مطالعے اور ان کے "محرکاتِ عمل" کے بدقت تجزیے سے قائم ہوا ہے' اور میں جماعت کے اربابِ فکر و نظر میں سے ان لوگوں کو کہ جنہیں جماعت کے کارکنوں کی صفوں میں شریک ہو کر عملاً کام کرنے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے' دعوت دیتا ہوں کہ وہ ذیل کی کسوٹی لے کر جماعت کے کارکنوں کے محرکاتِ عمل کا جائزہ لیں اور پھر خود سوچیں کہ اب ہمارے اصل نصب العین میں "زرِ خالص" کے ساتھ "کھوٹ" کس تناسب سے شامل ہو چکا ہے۔

"اور اگر خوش قسمتی سے پیروئ اسلام' اعلائے کلمۃ الحق اور اقامتِ دین کے عزائم کی توفیق مل چکی ہے تو غور کر کے اندازہ لگانا چاہیے کہ کہیں ان عزائم کی تہ میں مسلم قومیت کا جذبہ تو نہیں کام کر رہا ہے۔ کوئی شوقِ انجمن سازی' کوئی آرزوئے ناموری' کوئی ہوسِ روشناسی' کوئی فریبِ اقتدار طلبی' ان نعروں کا محرک تو نہیں ہے؟ اسی طرح کہیں اس مقدس فرض کو محض اس بنیاد پر تو بجالانے کا عزم نہیں ہے کہ موجودہ عالمگیر معاشی کشمکش اور عمرانی اضطراب

اور سیاسی اختلال کے ہنگاموں میں اسلام کا نظامِ سیاست و معیشت ہی ان ساری گتھیوں کا ایک موزوں حل نظر آرہا ہے؟"

("اساسِ دین کی تعمیر"------مولانا صدرالدین اصلاحی)

اس معاملے میں کچھ خامی 'میں' جماعت کے دورِ اول میں بھی پاتا ہوں اور اس کا تذکرہ 'میں' آئندہ ایک مستقل مبحث میں کروں گا۔ لیکن یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس دورِ ثانی میں تو یہ بات اس قدر واضح اور ظاہر و باہر ہے کہ جو اسے محسوس نہ کر سکے اسے یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اس کی قوتِ احساس و ادراک میں کوئی نقص و خامی موجود ہے!

عملی جدوجہد

اپنے نصب العین یعنی اقامتِ دین کے لیے طریق کار کے سلسلے میں جو وضاحتیں مثبت اور منفی طور پر دورِ اول میں کی گئی تھیں ان کا خلاصہ گزشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ اس پر دوبارہ ایک سرسری نظر ڈال کر اب دورِ ثانی کے طریق کار کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ: ؏

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

جو باتیں وہاں بالکل غلط ٹھہرائی گئی تھیں انہیں یہاں باقاعدہ اختیار کیا گیا۔ جن ذرائع سے "اسلامی حکومت کا قیام "ناممکن العمل بتایا گیا تھا' انہی پر یہاں طبع آزمائی کی گئی تھی اور جس راستے کے اختیار کرنے پر مسلم لیگ کی تنقیص کی گئی تھی ٹھیک اسی راستے پر جماعت اسلامی نے پیش قدمی شروع کر دی۔ دورِ اول اور دورِ ثانی کے مابین "طریق کار" کا یہ اختلاف بلکہ تضاد اتنا واضح ہے کہ درحقیقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ آج موجودہ طریق کار کے لیے خوشنما دلائل پیش کیے جا رہے ہیں لہٰذا------ اولاً اس تضاد کو واضح کرنے------ اور ثانیاً ان دلائل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے!

دو نکاتی پروگرام

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا وہ اول روز ہی سے دو نکات پر مشتمل تھا۔

(۱) ایک یہ کہ اس ملک کے دستور کو اسلام کے اصولوں کے مطابق بنوانے کی سعی کی جائے اور اس کے لیے رائے عامہ کو منظم کر کے جدوجہد شروع کی جائے اور

(۲) دوسرے یہ کہ یہاں کی قیادت میں انقلاب برپا کیا جائے۔

ان دو نکات کو میں نے محض وضاحت کی غرض سے علیحدہ بیان کر دیا ہے ورنہ ان دونوں نکات پر کام بیک وقت شروع ہو گیا تھا اور یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے چلے تھے (بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلے نکتے کی سعی وجہد کو بھی دوسرے کے لئے استعمال کیا گیا)

دونوں نکات کی نظری ابتدا قبل از تقسیم

ان دونوں نکات پر سعی وجہد شرع کرنے کے عزائم کا اظہار اوائل ۴۷ء کی تقاریر ہی میں کر دیا گیا تھا (یعنی تقسیم سے متصلاً قبل)

● نکتہ اول کے بارے میں اجتماع دار الاسلام منعقدہ مئی ۱۹۴۷ء کے موقع پر ایک تقریر میں صاف وضاحت ملتی ہے:

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہو گا۔ پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔"

(از "جماعت اسلامی کی دعوت" شائع شدہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء)

● اور نکتہ ثانی کے لیے ملاحظہ ہو تقریر "ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" سے ایک اقتباس:

"جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا..... اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور ان کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی...... جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویے اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظاموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو جائے گا..... آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت مہمل ہو جائیں گے۔ آج کے خیالات اور تصورات کے لیے اس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھ جائیں گی۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مرجائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ آج جو لوگ انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں!"

قرائن بتاتے ہیں کہ "قیادت" میں اس "خلا" کی توقع ہی نے اُس وقت دل میں اس بات کے امکانات روشن کیے تھے کہ تقسیم کے بعد "انقلابِ قیادت" کی مہم کو ایک ہی ہلے میں سر کیا جاسکے گا!

دونوں نکات پر کام کی عملی ابتدا بعد از تقسیم

تقسیم کے عملاً واقع ہو جانے کے بعد... حوادثِ تقسیم کے اثرات کے ذرا دُور ہو جانے پر ان دونوں نکات پر عملاً جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا۔

● ایک طرف

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لاء کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی

صاحب نے ریاستِ پاکستان کو مسلمان بنانے کے لیے تجویز کیا کہ "ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان میں حاکیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

۲۔ ریاست کا اساسی قانون شریعتِ خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہمیں پہنچی ہے۔

۳۔ تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جاسکے گا جو شریعت سے متصادم ہو۔

۴۔ ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی"۔

اور اس کے بعد اس تجویز کے کچھ الفاظ تبدیل کر کے اسے ایک باقاعدہ "مطالبہ" کی شکل دے دی گئی جو حسب ذیل ہے۔

"دستور ساز اسمبلی سے مسلمانانِ پاکستان کا مطالبہ"

چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور

چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

لہٰذا

اب قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی اس کے سوا

اور کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔
۳۔ تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔
۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات اُن حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کردیئے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں ہی مغربی پاکستان کا ایک مفصل دورہ کر کے مولانا مودودی صاحب نے لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعت اسلامی کے زیر اہتمام جلسہ ہائے عام منعقد کرا کے اس مضمون پر مشتمل تقاریر فرمائیں جو بعد میں "مطالبہ نظام اسلامی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان تقاریر میں مولانا نے مطالبہ نظام اسلامی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور اس کو ان دو امور پر مبنی قرار دیا کہ:

- اولاً جب ہم مسلمان ہیں تو ہماری حکومت کو بھی مسلمان ہی ہونا چاہیے اور
- ثانیاً یہ کہ "ہمارے مطالبہ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بحیثیتِ قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطہ زمین ایسا ملنا چاہیے ......الخ"

★ پھر اس کے لیے ایک اور جذباتی اپیل یہ کی کہ --- تقسیم ہند نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصے میں تو اسلام کا مستقبل تاریک کر ہی دیا ہے 'اب رہ گیا وہ قلیل علاقہ جس پر پاکستان مشتمل ہے تو یہاں بھی اگر اسلامی نظام قائم نہ ہوا تو گویا یہ اس پورے برِصغیر سے اسلام کا خاتمہ ہوگا۔

★ اور اسے مطالبے کی صورت میں پیش کرنے کی وجوہات یہ بیان کیں کہ

● "اولاً یہاں ایک مصنوعی انقلاب برپا ہوا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوا ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ انقلاب کے فوراً بعد آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی۔"

● دوسرے اس لیے بھی کہ "جن لوگوں کے ہاتھ میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں [a] وہ متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر یہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم نہ کیا جائے، کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ قائم کیا جائے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا نہ مسلمان مسلمان' بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا ہم معنی ہے اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ اسلامی سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی یہ اسلامی جمہوریت کا چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ لوگ جس معنی میں اسلامی نظام کے خواہشمند ہیں آپ اسی معنی میں اسے قائم کریں۔ آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔"

● تیسرے یہ کہ

"ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات دیئے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو اسی خلافِ اسلام طریق پر استعمال کر رہے ہیں جو قوم کو اسلام سے

---

[a] "ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں" لائق توجہ ہے۔

ہٹا کر غیرِ اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر فی الواقع عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنھوں نے مغربی اصولوں کو اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنا یہ خود بگڑے ہیں اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ ان اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیے ہیں۔ اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔"

● آخر میں گزارش اور اپیل کی کہ:

"آپ حضرات سے گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کے دل اسلامی نظام کے مطالبے پر مطمئن ہوں تو پھر اس کو باقاعدہ طور پر اپنا قومی مطالبہ بنایئے اور اس کے پلڑے میں اپنا پورا وزن ڈالیے۔"

● اور دوسری طرف

قیادت میں جس "خلا" کے رونما ہونے کی پہلے سے توقع تھی اسی کے احساس کو اجاگر کرنے اور ایک نئی "قیادت" کی ضرورت کا احساس شدت کے ساتھ بیدار کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

اس سلسلے میں "ترجمان القرآن" کے ان پرچوں کے اشارات کا مطالعہ بے حد مفید ہے کہ جو قیامِ پاکستان کے بعد رسالے کے از سرِ نو اجراء کے بعد تین چار ماہ تک شائع ہوئے۔ میری مراد جون ۴۸ء سے ستمبر ۴۸ء تک کے چار پرچوں سے ہے۔ (اکتوبر ۴۸ء میں مولانا مع اپنے دو رفقائے کار کے گرفتار کر لیے گئے تھے)

● پہلے پرچے میں جو جون ۴۸ء میں شائع ہوا مولانا مودودی صاحب نے:

(۱) سب سے پہلے تقسیم کے وقت کے حوادث اور ہنگاموں کا تذکرہ کیا اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کی ذمہ داری برِصغیر کی مختلف قوموں کے "قومی راہنماؤں" پر عائد کی۔

"ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دور میں یہاں کی مختلف قوموں کے راہنما اور سربراہ رہے ہیں یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں۔ دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی پیشوائی کی۔۔۔اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے۔ ایسے اناڑی اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ کھیل کھیلا تو در حقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں۔ ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیے۔"

(۲) پھر ایک نظر "تقسیم کے ڈرامے" پر ڈالی اور اس کے اصل تین کرداروں یعنی انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے کام کا جائزہ لیا اور سب سے آخر میں مسلم لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔ دس سال سے مسلمانوں کی قیادتِ عظمٰی جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دولِ یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے۔۔۔۔۔ اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کشاکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں انہوں نے خود اپنی قوم کی اخلاقی مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبے کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی!....."

....."اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار

کیا جاسکے لیکن اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر.....''

● دوسرے پرچے میں جو جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا مولانا نے مسلم ہندوستان کی گزشتہ دس گیارہ برس کی تاریخ کا خلاصہ بیان کیا کہ کس طرح ''ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگریس کو بر سر اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے کا پروگرام سن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے''--- پھر کس طرح اس مسئلے پر مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ جن میں سے ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ''خطرہ وَطرہ کچھ نہیں ہے سب تمہارا وہم اور انگریز کا ولایا ہوا اڑاوا ہے''..... اور دوسرے کا کہنا تھا کہ ''خطرہ واقعی اور حقیقی ہے اور یہ سیلاب آزادیٔ وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو امپریلزم کا سیلاب ہے''---- پھر کس طرح اس مؤخر الذکر گروہ میں بھی دو رائیں پیدا ہو گئیں: ایک یہ کہ ''مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔'' اور دوسری یہ کہ ''تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں..... جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔'' پھر کس طرح مسلم عوام کی غالب اکثریت نے اس دوسری رائے کو قبول کیا اور اس کے تحت ایک قومی جنگ لڑی۔ اس کے بعد مولانا مودودی اس قومی تحریک کی قیادت کی غلطیوں کو ایک ایک کر کے گنواتے ہیں اور آخر میں ٹیپ کا بند ارشاد ہوتا ہے کہ:

''جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو امٹ ہے' اب اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ اس پر اس حیثیت سے بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لیے

بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل
کر چکی ہے.....ا"

- تیسرے پرچے میں جو اگست ۴۸ء میں شائع ہوا مولانا نے ان بڑے بڑے مسائل کا جائزہ لیا جن سے مسلمان اس وقت "بحیثیت ایک قوم کے" دوچار تھے۔ اور ان کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد عوام کو بتایا کہ وہ اپنی موجودہ قیادت کا جائزہ اس اعتبار سے لیں کہ اس کے اندر ان مسائل کو حل کرنے کی کس قدر اہلیت موجود ہے:

"اور قیادت کا اصل محکِ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں حل کرنے کی اہلیت
فکری اور اخلاقی اعتبار سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے ا"

- چوتھے پرچے میں جو ستمبر ۴۸ء میں شائع ہوا' مولانا نے "دو ایسے زبردست حادثوں" کا ذکر کیا جو اس مہینے مسلمانوں کو پیش آئے اور جنہوں نے ان کی قومی زندگی کو ایک صدمہ عظیم پہنچایا تھا۔

(۱) "پہلا حادثہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی مرحوم کی وفات کا" جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے جب یہ لکھا کہ:

"بے وقت موت ایک ملحدانہ اصطلاح ہے۔ مسلمان کے نزدیک ہر موت اپنے ٹھیک وقت پر آتی ہے اور خدا اس کا وقت کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ اپنی حکمت اور مصلحت کے اعتبار سے مقرر کرتا ہے....."

تو غالبا مولانا کے پیش نظر اس حادثے کی یہ مصلحت اور حکمت تھی کہ مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ کے اس ستون کے گر جانے کے بعد انقلابِ قیادت کا کام پہلے سے آسان ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا زبردست حادثہ جو "قوم کو پیش آیا" وہ سقوطِ حیدر آباد تھا۔ اس پر بھی مولانا نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔۔۔اور آخر میں قوم کو یہ پتے کی بات بتائی کہ:

"آج اس جمہوریت کے دور میں عوام کا وہی مقام ہے جو پہلے بادشاہوں کو حاصل تھا۔۔۔۔اقتدار اور اختیار کا منبع اب بادشاہ نہیں بلکہ ملک کے عوام ہیں۔

زندگی کا سارا نظام اسی وقت درست رہ سکتا ہے جب کہ عوام الناس کا شعور درست ہو، ان میں برے اور بھلے کی تمیز ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک سمجھیں کہ کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے!"

اس طرح مولانا نے "انقلابِ قیادت" کے لیے فضا کو ہموار کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح ان دونوں نکات پر عملی جدوجہد شروع ہو گئی------اور دورِ ثانی کے اس طریق کار کی بنیاد عملاً رکھ دی گئی جس پر جماعت اسلامی تاامروز عمل پیرا ہے!

تضاد کیوں محسوس نہ ہوا؟

دورِ اول اور دورِ ثانی کے طریق کار میں اصولی فرق اور تفاوت-----بلکہ تضاد اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اول تو جن لوگوں کے ہاتھوں دورِ اول کے طریق کار کی نیو رکھی گئی آخر کیسے ممکن ہوا کہ وہ دورِ ثانی میں بالکل مخالف سمت میں چل کھڑے ہوئے اور ثانیاً یہ کہ جو لوگ دورِ اول کی دعوت سے کھنچ کر آئے تھے اور جن کے ذہن و دماغ کو دورِ اول کی تحریروں نے ایک خاص طرز پر ڈھال دیا تھا آخر وہ کیسے دورِ ثانی میں ایک بالکل مختلف طرز کی تحریک میں Fit ہو گئے!

جہاں تک اس "استفہامِ استعجابی" کے پہلے جزو کا تعلق ہے اس سے تو میں بعد میں ایک مستقل باب میں بحث کروں گا لیکن جہاں تک اس کے دوسرے جزو کا تعلق ہے اس کے بارے میں چند معروضات اسی وقت مناسب خیال کرتا ہوں-----اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تبدیلی اصولاً تو اگرچہ ایک دم آگئی تھی لیکن اس کے مطابق جماعت کے تفصیلی نقشے کو بدلتے ہوئے ذرا دیر لگی اور "مقتدیوں" میں سے بہت ہی کم لوگ اتنی اونچی ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جو ایک باریک سے اصولی فرق کو محسوس کر سکیں۔ وہ اس فرق کو اسی وقت محسوس کرپاتے ہیں جب کہ وہ ایک اصولی تبدیلی عملی اثرات پیدا کر چکے اور آج جبکہ طریق کار کی یہ تبدیلی پوری طرح برگ و بار لا چکی ہے، جماعت کے اندر اکثر لوگ کم از کم یہ ضرور محسوس کر رہے

ہیں کہ "اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی" اور "کچھ نہ کچھ ہم بدلے ضرور ہیں" [۵۸] یہ دوسری بات ہے کہ ان کی اکثریت ابھی تک اس تبدیلی کا تجزیہ نہیں کر پائی ہے اور انگلی رکھ کر نہیں بتا پائی کہ ٹیڑھ یہاں واقع ہوئی ہے۔ دوسری یہ بات ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ایک وقت میں عوام ایک ہی بات سوچ پاتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حال کے ساتھ ساتھ ماضی اور مستقبل پر بھی نگاہ رکھ سکیں۔۔۔ کسی تحریک کے دوادوار کا فرق صرف اسی وقت نگاہوں کے سامنے آ سکتا ہے جب کہ اس کے دونوں ادوار کا تقابلی مطالعہ بیک وقت کیا جائے۔ یہاں یہ صورت ہوئی کہ جب پہلا دور تھا تو اس میں مگن تھے اور پوری طرح مطمئن۔ اور جب دوسرا دور آیا تو اس میں الجھ گئے اور اگر دل میں کبھی کوئی کھٹک پیدا بھی ہوئی تو اسے وقت کی ہنگامی مصروفیتوں نے دبا دیا اور اس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ اس پر سوچ بچار کر کے کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

بہر حال اب جب کہ یہ دونوں ادوار بیک وقت سامنے رکھ دیئے گئے ہیں ان کا آپس میں فرق و تفاوت بالکل نمایاں اور واضح ہے۔ آیئے ذرا دونوں نکات کا جائزہ لیں!

نکتہ اول میں تضاد

★ دورِ اول میں پوری شدت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ "اسلامی حکومت" کے قیام کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں اقتباسات مندرجہ بر ص ۴۹۔۷۸ تحریر ہذا)

---

[۵۸] اور یہی وہ عمومی احساس تھا جو جماعت اسلامی کے ارکین اور کارکنان کی ایک بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا تھا جس نے نومبر ۱۹۵۵ء کے آل پاکستان اجتماع کے موقع پر اتنی شدت اختیار کی کہ جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کو اس کے اسباب کا سراغ لگانے کے لئے "جائزہ کمیٹی" تشکیل کرنا پڑی۔

لیکن اب پورے اطمینان سے کہہ دیا گیا کہ

"واضح طور پر جان لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے.......!" (رسائل و مسائل۔ مولانا مودودی)

اور پھر جس طریقے کو واحد ممکن طریقے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا یعنی یہ کہ "معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور اور ارادے کو بتدریج اس حد تک نشو و نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے"۔۔۔۔۔اسے اب ایک طریقے کی حیثیت سے تسلیم کر کے ترک کر دیا گیا اور اس طریقے کو اپنا لیا گیا جس کے بارے میں بالوضاحت کہا گیا تھا کہ اس سے اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں ہے۔

★ دورِ اول میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تحریک مسلم لیگ اپنی نوعیت اور طریق کار سے صرف ایک قومی سٹیٹ وجود میں لا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کا اس کے ذریعے قائم ہو جانا بالکل ایسے ہے جیسے نیم کے بیج سے آم کے درخت کا اگ آنا۔

لیکن اب زور دار دلائل کے ساتھ ثابت کیا جانے لگا کہ تحریک پاکستان کا عین تقاضا یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو۔ اور اس میں ایک ٹھیٹھ اسلامی ریاست قائم ہو۔ کہا گیا کہ تحریک پاکستان کا منطقی نتیجہ ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے۔ اور خواب دیکھے جانے لگے کہ تحریک پاکستان ہی کو اس کے منطقی نتائج پر پہنچا کر اسلامی نظام کو وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

★ پہلے واضح طور پر اعلان کیا گیا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی ہم مجبور رہوں گے کہ اپنے اسی فطری طریق کار پر کام کرتے چلے جائیں۔ مسلمانوں کے ایک قومی سٹیٹ کے عالم وجود میں آ جانے سے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام میں کسی آسانی کی توقع نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ جب ہمیں پھر بھی آج ہی کی طرح تحریک چلانی ہو گی تو کیوں نہ ابھی سے اپنے طریق کار کے مطابق کام شروع کر دیں۔ ایک لا حاصل کام کے

لیے ہم اپنی منزل کھوٹی کیوں کریں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس مندرجہ بر ص ۱۷ تحریر ہذا)

لیکن اب --- اپنے آپ کو اصولاً تحریک پاکستان میں فٹ کر لیا گیا۔ اور ----- امید باندھی گئی کہ قیام پاکستان کے ذریعے

"اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔"

(ملاحظہ ہو قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)

★ کہا گیا تھا ----- "وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہو گا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں ان سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے ----- غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی سے دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"

لیکن اب امیدیں باندھی گئیں کہ:

"جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اپنے خلوص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں-----"

اگر یہ بھی "تضاد" نہیں ہے تو فرمایا جائے کہ تضاد اور کس چیز کا نام ہے!

ذرا ایک نظر "ریڈیو پاکستان" سے نشر شدہ اس مباحثے پر بھی ڈال لیجیے جو ریاست پاکستان کی آئندہ نوعیت پر مولانا مودودی صاحب اور جناب وجیہ الدین صاحب کے درمیان ہوا۔ اس مباحثے میں سائل (جناب وجیہ الدین) کا سوال ملاحظہ ہو!

س۔ "میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج' اخلاق' عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا پرتو نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس اندازِ فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اس طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصل اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ تعداد مضبوط ہو جائے گی اور قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے' اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرلے گا۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی دور ہے جب ہم ملکی طرز پر اسلامی تصورات کو قبول کرلیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں"۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں جناب سائل بالکل اسی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ جو خود جماعت اسلامی نے اپنے دورِ اول میں پیدا کی تھی۔ ٹھیک وہی نقطۂ نظر جو کسی ملک کے سیاسی نظام اور اس کی حکومت کی ہیئت کے بارے میں خود مولانا مودودی صاحب نے ایک طویل عرصے تک پیش فرمایا تھا جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کا جواب تھا:

"آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان

اور اس خواہش کا پر تو ہو۔ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور' اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟......"

یہاں مولانا نے اصل بات سے کنی کترا کر بات بنانے کی کوشش فرمائی ہے! اور اس مفروضے کے دامن میں پناہ لی ہے جو خط کشیدہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے----- لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ غلط نہیں تھا۔ اور خود مولانا کے قبلِ تقسیم کے ارشادات' سے بالکل مختلف اور متضاد نہیں تھا!

نکتۂ ثانی میں تضاد

● انقلابِ قیادت کے بارے میں پہلا نقطۂ نظریہ تھا کہ "قومی ریاست میں جب تک ووٹروں ہی کے افکار و نظریات و ذہنیت و عقائد بدل نہ دیئے جائیں اس وقت تک کسی اصول پسند اور اسلام پرست قیادت کا ان میں سے ابھرنا بالکل ناممکن ہے"۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اقتباس از "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" مندرجہ بر ص ۶۹ تحریر بند ۱)

لیکن---اب عوام کی ذہنیت' ان کی پسند اور ناپسند' ان کے خیالات و افکار اور ان کی سیرت و اخلاق میں انقلاب پیدا کیے بغیر محض اس بات سے کہ انہیں اس وقت کی "قومی قیادت" سے بدظن اور مایوس کر دیا جائے' اس بات کی توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں کہ ایک صالح قیادت برپا ہو جائے گی۔

اس معاملے میں دورِ اول کے خیالات اور نظریات سے ایک واضح تضاد کے علاوہ "سادہ لوحی" اور "بھولے پن" کا بھی ایک شاہکار سامنے آتا ہے: کیا واقعی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ "انقلابِ قیادت" اگر اس کا مطلب قیادت میں کوئی اصولی اور

بنیادی تغیر ہے' صرف اس طرح رونما ہو سکتا ہے کہ ایک خاص وقت کی بر سر اقتدار ٹیم سے عوام کو بدظن کر دیا جائے۔ یہاں یہ بات تو صحیح طور پر ہی سمجھی گئی تھی کہ تقسیم کے بعد قیادت کے میدان میں اس بنا پر ایک ہلکا سا خلا واقع ہوا تھا کہ اس وقت کی قیادت نے صرف قیام پاکستان تک کے لیے پروگرام اپنی قوم کے سامنے رکھا تھا اور اب جس مقصود کے لیے سعی کی گئی تھی اس کے حاصل کر لینے کے بعد اس کے پاس قوم کے لیے کوئی خاص پروگرام نہ تھا اور یہ قیادت کرنے والی ٹیم میں افراد کی تبدیلی کے لیے ایک آسان موقع تھا لیکن کیا بس اسی سے قیادت میں کوئی اصولی تغیر بھی پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جس نے بھی ایسا سمجھا اس نے اپنی سیاسی بے بصیرتی کا کھلا ثبوت فراہم کیا۔ آخر اس وقت انفرادی اور اجتماعی زندگی جس نہج پر گزاری جا رہی تھی اس میں کون سا اصولی اور بنیادی تغیر واقع ہوا تھا؟ کیا لوگوں کے نظریات بدل گئے تھے اور ان کے افکار میں انقلاب آ چکا تھا؟ کیا ان کی پسند اور ناپسند کا معیار اسلام اور صرف اسلام بن چکا تھا؟--- کیا انہوں نے اسلام کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات کو تبدیل کر لیا تھا؟--- کہ اب اس بات کی توقع کی جاتی کہ ان کی قیادت میں اس طرح کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے کہ "ایک صالح قیادت" بر سرِ کار آ جائے--- اور اگر ایسی کوئی تبدیلی پورے نظام زندگی میں واقع نہیں ہوئی تھی اور یقیناً بالکل نہیں ہوئی تھی تو پھر انقلابِ قیادت کی توقع بچوں کی سی خام خیالی سے زیادہ اور کیا قرار دی جا سکتی ہے؟

یہ صحیح ہے کہ آپ اس وقت کی قیادت کرنے والی ٹیم پر تنقید کر کے اسے کمزور کر سکتے تھے اور اس میں کلام نہیں کہ عوام کو ان سے بدظن اور مایوس کیا جا سکتا تھا--- لیکن یہ بات آپ نے کس طرح سمجھ لی تھی کہ اس طرح قیادت میں صالح انقلاب بھی برپا کیا جا سکتا ہے--- اس تخریب کے بعد کسی تعمیر کی توقع بالکل غلط تھی۔ تخریب آپ کر سکتے تھے اور آپ نے کی' لیکن تعمیر کے سلسلے میں آپ کی توقعات "سہانے خواب" سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھیں اور اس کا تجربہ آپ کو بعد کے حالات سے ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور کی ان تحریروں کا مطالعہ کیا جائے جو انقلابِ قیادت کے

سلسلے میں خصوصاً نعیم صدیقی صاحب کے قلم سے نکلیں تو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے علمی مرتبے کے لوگ جن کا مطالعہ وسیع اور جن کی نظریں باریک بین اور دُور رس واقع ہوئی ہیں اس دَور میں اس معاملے میں کس طرح کی بچگانہ باتیں کرتے رہے ہیں! انقلابِ قیادت کا نعرہ اس طرح بلند کیا گیا اور اس کے لیے اتنے زور سے بلّہ بولا گیا (اگرچہ یہ سب کچھ تھا صرف "کاغذی" دنیا میں---یعنی صرف ترجمان القرآن کے اشارات کے کالموں میں ہی) کہ محسوس ہوتا تھا کہ بس یہ مورچہ تو اب سر ہونے کو ہے اور یہ تبدیلی تو اب واقع ہوا چاہتی ہے!!

اس میں حیرت و استعجاب کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ آخر وہ کون سی قیادت تھی کہ جس کو برسرِ کار لانے کے لیے یہ پاپڑ بیلے جا رہے تھے۔ ملک کے دوسرے سیاسی حلقوں اور طبقوں اور مسلم لیگ کی اُس وقت کی قیادت میں تو سرے سے کوئی اصولی اور بنیادی فرق موجود ہی نہ تھا بلکہ دوسرے حلقے ہمارے مطلب کے لحاظ سے مسلم لیگ سے بھی زیادہ ناکارہ تھے---تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انقلابِ قیادت سے مراد ان میں سے کسی کی قیادت کا برسرِ اقتدار آنا ہو---تو پھر لے دے کر ایک ہی گروہ رہ جاتا ہے یعنی جماعت کا اپنا حلقہ۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا جماعت کے اکابرین واقعی یہ خیال رکھتے تھے کہ اس وقت ان کے پاس ایک ایسی ٹیم پیدا ہو چکی تھی جو ایک ملک کے کاروبار اور اس کے نظام کو سنبھالنے کے قابل ہو' قطع نظر اس سے کہ اس کے واقعتاً اقتدار تک پہنچنے کے لیے حالات سازگار تھے یا نہ تھے--- میں تو اس بات میں بھی شبہ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے بارے میں محض ایک خوش فہمی اور خام خیالی قرار دیتا ہوں کہ جماعت کے پاس اُس دَور ہی میں نہیں' آج تک بھی کوئی ایسی ٹیم موجود ہے جو ملک کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

----بہرحال ان دونوں نکات کے سلسلے میں یہ وہ واضح تفاوت و تضاد ہے جو دورِ اول اور دورِ ثانی کی جماعت اسلامی کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہ وہ "خام خیالیاں" ہیں جن میں جماعت کی قیادت کرنے والی ٹیم نے پاکستان بنتے ہی اپنے آپ کو

مبتلا کر لیا تھا۔

آغازِ کار

یہاں تک میں نے اس اصولی اور بنیادی تضاد کو واضح کیا ہے جو دورِ اول اور دورِ ثانی کے طریقہ ہائے کار میں پایا جاتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا جائزہ لے لیا جائے کہ گزشتہ ۹ سالوں [۱] میں ان دونوں نکات پر کیا کیا کام ہوا۔ (یہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ان ۹ سالوں میں جماعت کی تمام تر مسائل صرف انہی دو کاموں پر صرف ہوئی ہیں۔ علمی انقلاب اور اخلاقی اصلاح کا نام تو ضرور کبھی کبھی لیا گیا ہے لیکن ان دونوں جہتوں میں عملاً کوئی کام نہیں ہو سکا ہے) ساتھ ہی اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اس کام کے کیا نتائج ظاہر ہوئے۔ اور اس ۹ سال میں "ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا"۔۔۔ اس "میزانیۂ نفع و نقصان" کے ساتھ ساتھ ان گھنسوں کا تذکرہ بھی آ جائے گا جن میں جماعت اسلامی نے اپنے آپ کو اس غلط طریق کار کی بدولت پھنسا لیا ہے۔۔۔۔ اس پورے جائزے سے معلوم ہو گا کہ اس غلط طریق کار نے ہمیں کہاں لا کھڑا کیا ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ساتھ ہی اس سے یہ بھی واضح ہو گا کہ ایک صحیح راہ پر چلنے والے کے لیے "فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ" اور ایک غلط کار کے لیے "فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ" کی الٰہی سُنّت کا مظاہرہ عملی دنیا میں کس طرح ہوتا ہے۔

قراردادِ مقاصد

مولانا مودودی صاحب نے ۴۸ء کے اوائل میں کام کی ابتداء بیک وقت دو

---

[۱] یہ تحریر ۱۹۵۶ء کی ہے۔

نعروں یعنی "دستورِ اسلام" اور "انقلابِ قیادت" سے کی تھی اور دونوں کے لیے ابتدائی کام بھی خود ہی مکمل کر دیا تھا۔ ۴۸ء کے اواخر میں مولانا تو گرفتار کر لیے گئے لیکن "دستورِ اسلامی" کی یہ مہم زور پکڑتی چلی گئی۔ اس کا مطالبہ عوام کا اپنا مطالبہ بن گیا اور برِّ صغیر ہند و پاک کے دورِ جدید کی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ مسلمان رائے عامہ نے اپنا مظاہرہ اس قوت کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بالآخر ۱۲مارچ کو "قراردادِ مقاصد" پاس ہو گئی۔

یہ وہ پہلی "فتح" ہے جو پاکستان میں جماعت اسلامی کو حاصل ہوئی۔ اس کا خوب چرچا کیا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ قرارداد نہ صرف پاکستان کی بلکہ خود جماعت اسلامی کی تاریخ میں ایک بہت بڑے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جدّوجہد کے دوران میں جو باتیں کہی گئیں اور اس کے پاس ہونے پر جو ردِّ عمل جماعت کی جانب سے ہوا اس کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔

● اس کے لیے "مطالبہ" کی مہم کے دوران میں..... "برسراقتدار گروہ" کی اس کو ماننے سے پہلو تہی اور قرارداد مقاصد کے پاس کرنے میں تعویق و تاخیر کی صرف ایک وجہ بیان کی گئی کہ..... "یہ لوگ مغرب پرست ہیں، مغربی افکار و نظریات ان کے ذہنوں میں سرایت کر گئے ہیں اور مغربی طرز کی ریاست اور معاشرے ہی کو یہ پاکستان میں برپا کرنا چاہتے ہیں"..... جہاں تک ان باتوں کا تعلق ہے ان سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک دوسری بات کو نظرانداز کر دینا بھی ناانصافی ہے کہ ان کی ہچکچاہٹ کی ایک اور بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جماعت نے صرف دستوری مطالبہ ہی پیش نہ کیا تھا بلکہ ساتھ ہی انقلابِ قیادت کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا اور برسرِاقتدار گروہ صاف دیکھ رہا تھا کہ اس مطالبے کے منظور کر لینے کا مطلب اسی "نئی قیادت" کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا ہو گا..... اس سلسلے میں میرا مفہوم آپ کے سامنے مزید اس طرح واضح ہو سکے گا کہ آپ اپنے ذہن سے اس معاملے کو نکال کر کسی اور ایسے معاملے کا تصور کریں کہ ایک شخص ایک بات کو حق سمجھتا ہے اور اگر عام حالات میں وہ

بات اس کے سامنے لائی جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں تأمل نہیں کرتا لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس بات کے تسلیم کرانے سے اس کے پیش کرنے والے کے پیش نظر "کوئی اور مقصد" بھی ہے تو فطری طور پر وہ اس حق بات کو قبول کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے اور پس و پیش سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ میں اس بات پر تو اصرار نہیں کرتا کہ مسلم لیگی قیادت کی "مطالبہ" کے منظور کرنے میں پس و پیش کرنے کی نوعیت بعینہٖ یہی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ...... ایسی بات بھی تھی ضرور!

- پھر اس قرارداد کے پاس ہونے پر اس کا پورا Credit خود لینے کی کوشش کی گئی اور اسے اپنی "فتح" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

اولاً یہ بات خلافِ واقعہ تھی اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جماعت نے واقعتاً اس کام کے سلسلے میں بڑی جدوجہد کی تھی اور اس قرارداد کے پاس ہونے میں غالب حصہ اسی کی مساعی کا تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہونے میں کچھ اور حلقوں کی مساعی کو بھی دخل تھا اور علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اور ان کے رفقاء کی مساعی تو اس معاملے میں فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔

اور ثانیاً اس طرزِ بیان نے جماعت اسلامی کو اسلامی نظام ----اور نظامِ اسلامی کو جماعت اسلامی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دے دیا اور اس طرح غریب "اسلامی نظام" بین الجماعتی سیاست کا مسئلہ بن کر رہ گیا۔ شاید اسے "دُور کی کوڑی" لانا کہا جائے لیکن ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ وہ ذہنیت جس کا مظاہرہ کراچی میں مجلسِ عمل کے اجلاس میں مولانا محمد علی جالندھری صاحب نے کیا کہ:[1]

"کہ اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے ساتھ لوگ جس جماعت کو لازماً مراد لیتے ہیں وہ جماعت اسلامی ہے۔ اگر اس کی جدوجہد میں حصہ لیا جائے تو

---

[1] یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک ختم نبوت کے دوران کراچی میں کل جماعتی مجلس عمل کے اجلاس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبے کو "مطالبہ دستور اسلامی" میں مدغم کر دیا جائے!

Credit سارا جماعت لے جائے گی۔ ہمارے ہاتھ کیا آئے گا!" (روایت بالمعنیٰ)

جماعت اسلامی کے اپنے اس طرزِ بیان ہی سے پیدا ہوئی تھی۔

ثالثاً مسلم لیگی قیادت کے بارے میں یہ بیان کیا گیا کہ یہ قرارداد اس نے پاس نہیں کی بلکہ اس سے کرائی گئی ہے۔ ع

"کہ میں آیا نہیں لایا گیا ہوں"

اور اس کے پاس ہونے کو ان کے مقابلے میں اپنی ایک "فتحِ مبین" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس قرارداد کے پاس کرنے والوں کے بارے میں مولانا مودودی کے ریمارکس ملاحظہ ہوں:

"ان حضرات کے قراردادِ مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی میم صاحبہ کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے اور وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کلمۂ اسلام پڑھ لے۔ لیکن نہ اس کلمے سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی تغیر آئے اور نہ اس کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو۔ جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی ہی میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔"

ذرا نفسیاتی اعتبار سے خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی پوزیشن میں رکھ کر سوچیے کہ کیا اس سے چڑ اور جھنجلاہٹ کا پیدا ہونا فطری بات نہیں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان لوگوں میں اسلامی نظام۔۔۔ اور قراردادِ مقاصد کے بعد دستورِ اسلامی کے مطالبے سے جو چڑ پیدا ہوئی وہ سراسر اس طرزِ بیان ہی سے پیدا ہوئی لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس میں اس کو دخل کم و بیش تھا ضرور!

پھر مجھے تو اس "فتحِ عظیم" ہی میں ان تمام مخمصوں اور Complications کی بنیاد نظر آتی ہے جن سے جماعت کو بعد میں دوچار ہونا پڑا۔

● اس قرارداد ہی سے "ریاستِ پاکستان" کی نظری اور اصولی حیثیت اور اس کی واقعی اور حقیقی کیفیت کے تضاد کا وہ مخمصہ شروع ہوا جس نے بعد میں جماعت کی راہ میں ایک ایک قدم پر مشکلات پیدا کیں۔

—— حقیقتاً —— قرارداد سے قبل اور اس کے بعد کے پاکستان میں سرِ مُو فرق واقع نہ ہوا تھا۔ وہی نظریات و افکار تھے' وہی کردار و اخلاق تھا' وہی دلچسپیاں تھیں' معاشرے کی حالت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا۔ اوپر سے نیچے تک کہیں کوئی تبدیلی نہ تھی ---- خود مولانا مودودی کے الفاظ میں:

"درحقیقت یہ ایک ایسی بارش تھی کہ نہ جس کے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی۔ اس قرارداد کے پاس ہونے کے دو چار دن پہلے تک بھی اس بات کے کوئی آثار نہیں تھے کہ کوئی واقعہ ہونے والا ہے۔ اس بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوا تک نہیں چلی بلکہ اس کے برس جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک حادثہ تھا جو آیا اور گزر گیا۔"

—— لیکن نظری طور پر —— اس قرارداد نے ریاست پاکستان کو ایک "اسلامی ریاست" کا درجہ دے دیا۔ مولانا مودودی نے اس قراردادِ مقاصد کا تجزیہ کر کے فرمایا:

"---- ان باتوں کی وجہ سے اس اقرار کے وہی معنی ہیں جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہیں۔ پس اس کلمے کے ادا کرنے کی وجہ سے ہماری ریاست اصولی حیثیت سے اسلامی ہو گئی ہے ----"

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "قراردادِ مقاصد" سے پورے کلمۂ طیّبہ کا مفہوم اخذ کرنا بھی ایک طویل اور پیچ در پیچ استدلال کے ذریعے ہی ممکن ہوا تھا۔ اس قرارداد کی کُل "اسلامیت" یہ چند الفاظ ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے

اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔"

ان میں "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا مفہوم تو بہرحال ازخود موجود ہے لیکن "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہ" کا مفہوم اس استدلال سے اخذ کیا گیا ہے کہ جس کے تحت خود "لا الٰہ الا اللّٰہ" سے بھی اسے اخذ کیا جا سکے۔ غور کا مقام ہے کہ اگر اس استدلال سے کلمۂ طیبہ کے جزوِ ثانی کو اس کے جزوِ اول ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے تو اس جزوثانی کے ایک مستقل اور لازمی جُز کی حیثیت سے کلمے میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جماعت اسلامی منتظر بیٹھی تھی کہ دستور ساز اسمبلی ذرا ایک بات کردے خواہ وہ کتنی ہی ناقص اور نامکمل ہو تو فوراً اسلامی ریاست کا لیبل پاکستان پر چسپاں کر دیا جائے!

بہرحال ریاستِ پاکستان کی نئی نظری حیثیت نے جماعت اسلامی کے طرز عمل کو ایک "سیاسی جماعت" کے نقشے پر ڈھال دیا۔ حالانکہ حقیقی صورت حال کے اعتبار سے ابھی ایک "انقلابی جماعت" کی سی جدّوجہد درکار تھی۔ سیاسی جماعت اور انقلابی جماعت کے طریق کار اور طرز عمل میں جو باریک سا فرق ہوتا ہے اسے خود مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں سنئے:

"اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے کہ جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کے طور پر ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے---- --- دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریے اور جہانی تصور (World Idea) لے کر اٹھتی ہے جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے بلالحاظِ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصولِ

اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔۔۔۔"

دونوں کی نوعیت کے اس فرق کے ساتھ ساتھ دونوں کے کارکناں کے نقطۂ نظر میں بھی زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ سیاسی جماعت کے کارکن اس کے کام کو بس ایک اچھا اور ملک و ملت کے لیے مفید کام تو سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ کسی طرح بھی ان کے لیے "زندگی اور موت" کا مسئلہ نہیں بن سکتا جبکہ ایک انقلابی جماعت کے کارکن اپنے پیش نظر کام کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتے ہیں؎ ایک اسلام پسند سیاسی جماعت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے نقطۂ نظر میں تو زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ پہلی طرح کے لوگوں کے لیے ان کا کام ایک "اضافی نیکی" اور بھلائی کا کام ہوتا ہے اور دوسری طرح کے لوگ اپنے کام کو "فرضِ عین" سمجھتے ہیں اور اسی کی ادائیگی پر اپنے ایمان و اسلام کا سارا دارومدار سمجھتے ہیں۔ سیاسی جماعت کے کارکن ایک نظام کو بنیادی طور پر صحیح سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ اس میں رہتے ہوئے پورے اطمینان کے ساتھ معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور "پھلنے اور پھولنے" کی فکر کرتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے ان کو دل میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ایک انقلابی جماعت

؎ یہی وجہ ہے کہ اس دور ثانی میں دور اول کے اثرات کی حیثیت سے جو انقلابی جوش کارپایا جاتا تھا ہے دور کے اپنے اثرات کے پیدا ہو جانے پر جب وہ ماند پڑ گیا تو پھر ہر کام اور ہر مہم کے لئے جماعت کے کارکنوں کو متحرک کرنے کی غرض سے جماعت کے سرکلروں میں ہر مرحلے کو "زندگی اور موت کے مسئلہ" کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی۔۔۔۔ فطری طور پر ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ انقلابی جوش کار تو اب ختم ہو ہی گیا تھا' اب تو ہر مرحلے پر تحریک پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ اس بات کو سمجھانے کی ضرورت تھی کہ یہ مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور اس پر نہ صرف مستقبل کا پورا انحصار ہے بلکہ ماضی کے کئے دھرے کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے کا دارومدار بھی اسی پر ہے!

کے کارکن کا معاملہ وقت کے نظام کے ساتھ تصادم اور کشمکش کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اس نظام کے ساتھ تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھلنے اور پھولنے اور ترقی کرنے اور مستقبل بنانے کا معاملہ تو دور رہا اس پر "قُوتِ لایموت" اور زندگی کی ناگزیر ضروریات کے لیے سعی و جہد اور وقت و محنت کا صرف بھی گراں گزرتا ہے۔ اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان چیزوں کا بس ایک ناگزیر سا حصہ اپنے لیے رکھ کر باقی سارے کا سارا اپنے پیشِ نظر انقلاب کے برپا کرنے میں صَرف کر دے۔ جماعت کے دَورِ اول کی خصوصیات میں مَیں بیان کر آیا ہوں کہ اُس وقت جماعت کے کارکنوں میں بعینہٖ یہی کیفیت پائی جاتی تھی۔ لیکن اس دورِ ثانی میں خصوصاً قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس کا لازمی اور فطری تقاضا تھا کہ ایسا ہو اور عملاً ایسا ہوا کہ اب جماعت کے کارکن ایک سیاسی جماعت کے کارکن معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں کام کا بس اسی قدر جوش اور ولولہ اور اس کے لیے اسی قدر ایثار و قربانی کا مادہ باقی رہ گیا ہے جتنا سیاسی جماعتوں کے کارکنوں میں ہوتا ہے الا ماشاء اللہ۔

اور یہ بھی اسی کا شاخسانہ تھا کہ چند سال بعد ہی جماعت کی رکنیت سے ملازمینِ سرکار کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ اسی وقت ہو جانا چاہیے تھا جبکہ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے پاکستان کو "اصولاً"

ملک نصر اللہ خاں صاحب ایم۔ اے' خلف الرشید ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز جماعت اسلامی کے پرانے متعلقین میں سے ہیں۔ اگرچہ زیادہ فعال نہیں تاہم ذہین ضرور ہیں ---- وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے ایک عرصے بعد تک جب جماعت کے رکن نہ بنے تو میں نے ان سے اس کے بارے میں ابتداءً سوال اور پھر بحث و تکرار شروع کی ---- انہوں نے اس وقت جو جواب دیا وہ ان کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا "اب جماعت کی رکنیت کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اب وہ ایک انقلابی جماعت نہیں بلکہ ایک سیاسی پارٹی ہے" ---- میں ان کی اس بات کو تو رد نہ کر سکا البتہ دوسرے استدلال سے ان کو قائل کیا کہ جماعت کی رکنیت ضروری ہے۔

ایک اسلامی ریاست تسلیم کر لیا تھا۔ اُس وقت شاید اس کا احساس نہ ہوا ہو لیکن جماعت کی نوعیت میں جو اصولی تغیر رونما ہو چکا تھا اس کا یہ نتیجہ بالآخر نکل کر رہا کہ "دین اور سیاست کی وحدت کا سب سے بڑا علمبردار" بالآخر یہ کہنے لگا کہ سرکاری ملازمین سیاست میں حصہ نہ لیں۔ (تقریر حیدر آباد۔ اور "رسائل و مسائل")

یہ ساری ہی باتیں قانوناً اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں اور اپنے پہلے قدم کو درست ثابت کرنے کے بعد منطق کے اعتبار اور علت و معلول کے فلسفے کے تحت ان تمام باتوں کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن عملاً یہ تمام باتیں اس لیے مضحکہ خیز اور بالکل غلط ہیں کہ پاکستان کی اسلامی ریاست بس اصولاً ہی اسلامی ہے۔ صحیح اسلامی انقلاب کی طرف ۴۷ء کے بعد ایک قدم بھی پیش قدمی نہیں ہو سکی ہے۔ اور یہ تمام باتیں عملاً اس وقت صحیح ہو سکتی تھیں جبکہ ایک اسلامی ریاست فی الواقع قائم ہو جاتی۔

● قراردادِ مقاصد پاس کرا لینے کی "فتح" نے جماعت اسلامی کو ایک اور عظیم نقصان جو پہنچایا وہ یہ تھا کہ اس کے قائد اپنے اور اپنی جماعت کی قوت اور عوام میں اس کے اثر و نفوذ کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور اس وقت کے بعد سے اپنے اثر اور اپنی طاقت کے بارے میں مبالغہ آمیز اندازے قائم کرنے کا جو

⬅ یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

> "کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے 'اب سیاسی بن گئے ہو' حالانکہ ہم پر ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے مذہبی رہے ہوں اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو......"

لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں کہنے والوں میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو اسی قسم کے احساسات کے تحت ایسی باتیں کہتے تھے لیکن کچھ وہ خود واضح نہ کر پاتے تھے اور کچھ ان کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی گئی۔

مرض جماعت اور اس کی قیادت کو لگا تھا وہ ابھی تک جان کالا گو چلا آرہا ہے۔
اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔
اولاً یہ کہ ہم نے اس کام کا سارا Credit خود لیا حالانکہ اس کے پاس ہونے میں دوسرے عوامل کو بھی دخل تھا۔ اور
ثانیاً جو کچھ اس میں ملا تھا اس کو ایک منطقی اور لمبے چوڑے استدلال کے ساتھ وہ کچھ ثابت کیا کہ جو در حقیقت اس میں موجود نہ تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر جماعت نے دستوری مطالبے کے ساتھ ساتھ انقلاب قیادت کا نعرہ بھی بلند نہ کر دیا ہوتا تو مسلم لیگی قیادت اتنا کچھ تو بآسانی شروع میں ہی تسلیم کر لیتی----!
بہر حال قراردادِ مقاصد جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل اور اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بہت گہرے اثرات جماعت کی آئندہ تاریخ پر مترتب ہوئے!

پہلی دستوری سفارشات

نکتۂ اول یعنی دستوری جدّ و جہد میں جماعت اسلامی کو بظاہر دوسری کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب ۱۹۵۰ء میں خان لیاقت علی خان صاحب کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں ہی پہلی دستوری سفارشات پیش ہوئیں اور بہت سی وجوہات کی بنا پر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئیں۔
ان سفارشات کے واپس لیے جانے کے اصل اسباب بر سرِ اقتدار گروہ کے آپس کے اختلافات، مشرقی اور مغربی پاکستان کی قیادتوں کا جوڑ توڑ اور مرکز میں حصولِ اقتدار کے لیے کشمکش اور تصادم تھے۔ یہ معاملہ قراردادِ مقاصد کی منظوری سے بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ اس معاملے میں واقعتاً عوامی مطالبے ہی کے اثرات تھے جو اس قرارداد کی شکل میں رونما ہوئے لیکن سفارشات کی واپسی کے معاملے میں ہر سوچنے سمجھنے والا شخص جانتا ہے کہ عوام کے مطالبات کو اس قدر دخل نہ تھا جس قدر

بر سرِ اقتدار ٹیم کی آپس کی پھوٹ اور باہمی تصادم کو۔ لیکن اس واقعے کو بھی "عوامی فتح"--- اور اس سے بڑھ کر "جماعت اسلامی کی فتح" قرار دیا گیا اور اس نے ان تمام نفسیاتی اثرات کو دوچند کر دیا جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے ـــــ یعنی بر سرِ اقتدار گروہ[۱۲۵] میں جماعت کے مطالبۂ نظامِ اسلامی و دستورِ اسلامی سے چڑ' مطالبۂ دستورِ اسلامی اور جماعت اسلامی کا آپس میں لازم و ملزوم سمجھا جانا اور جماعت اسلامی کے قائدین کا اپنی طاقت اور اثر و نفوذ کے بارے میں غلط اندازوں کا قیام۔

بہرحال پہلے نکتے پر جماعت اسلامی کی جدّوجہد 'گو بظاہر ہی سہی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی' لہٰذا فطری بات تھی کہ اس پر مزید جدّوجہد جاری رکھی جاتی اور ایسا ہی فی الواقع ہوا۔

انتخاباتِ پنجاب ۱۹۵۱ء

اپنے پروگرام کی شق اول کے ساتھ ساتھ جماعت نے شق دوم پر بھی مسلسل کام جاری رکھا تھا۔ تقسیم سے قبل جس بات کی توقع ظاہر کی گئی تھی (ملاحظہ ہوں ص ۱۲۱ پر مندرج اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ) اس کے احساس کو مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" کے مسلسل چار پرچوں (جون تا ستمبر ۴۸ء) کے

---

[۱۲۵] اس کا ایک اندازہ اس وقت ہوا جب ڈھاکہ میں مرحوم لیاقت علی خان صاحب سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں سوال ہوا تو ان کے منہ سے بے ساختہ جو بات جماعت اور مولانا کے بارے میں نکلی وہ یہ تھی کہ وہ اور جماعت اسلامی اقتدار کے طلب گار ہیں--- غالباً کچھ اس طرح کے الفاظ تھے :

> "وہ (مولانا مودودی) پاکستان کے امیر المومنین بننا چاہتے ہیں' حالانکہ پاکستان تو صحیح معنی میں ابھی بنا ہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کو بن لینے دو' پھر جو جس کی مرضی ہو بن لیتا!"

اس فقرے میں صرف لیاقت علی ہی نہیں اس وقت کے پورے بر سرِ اقتدار گروہ کا ذہن بول رہا تھا۔

"اشارات" میں اجاگر اور نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے بعد جناب نعیم صدیقی صاحب نے ترجمان کی ادارت سنبھالی اور ان کی زیرِ ادارت ترجمان کے اشارات اسی ایک مسئلے کے لیے وقف رہے۔ انہوں نے پاکستانی قوم --- اور مملکتِ خداداد پاکستان کے تمام مسائل کا حل "ایک صالح قیادت" بتایا۔ ساتھ ہی اس صالح قیادت کے نقش و نگار بھی اجاگر کیے جاتے رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے قلم سے ایک مضمون اسی موضوع پر لکھا ہوا ترجمان میں شائع ہوا۔

یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ پنجاب کے انتخابات کا موقع آگیا۔ یہ گویا اب تک کی ہوئی ساری محنت کا پھل حاصل کرنے اور فصل کاٹنے کا وقت تھا۔ چنانچہ جماعت نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

پہلی اسیری سے رہا ہونے کے فوراً بعد جو تقریر مولانا مودودی صاحب نے لاہور میں کی' اس میں انتخاب میں حصہ لینے کے ارادے کا اظہار ہو گیا تھا اور اسی میں جماعت کا ایک بے قاعدہ منشور بھی پیش کر دیا گیا تھا۔ انتخاب کے موقع پر منشورِ جماعت اسلامی کو باقاعدہ مرتب کر کے بڑی آن بان کے ساتھ شائع کیا گیا اور انتخابات میں چھلانگ لگا دی گئی۔

اس موقع پر اولاً جماعت اسلامی نے علیٰ رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا کہ محض اس منفی مقصد کی خاطر کہ برسرِ اقتدار گروہ کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے ہمارا کسی ایسے گروہ یا کسی ایسی جماعت سے تعاون اور اشتراک کرنا خارج از بحث ہے جو نظریات و مقاصد اور اصول و طریقہ ہائے کار میں ہم سے اختلاف رکھتے ہوں۔ یاد رہے کہ اس موقع پر مرحوم حسین شہید سہروردی صاحب کی عوامی لیگ اور نواب ممدوٹ صاحب کی جناح لیگ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر "جناح عوامی لیگ" کی شکل اختیار کر چکی تھیں اور ان دونوں راہنماؤں کی طرف سے بار بار اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ جماعت اسلامی بھی ان کے ساتھ تعاون کرے تاکہ یہ تمام قوتیں مجتمع ہو کر کوئی مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ لیکن جماعت اسلامی نے اپنے متذکرہ بالا اصول کی بنا پر ایسی تمام

دعوتوں کو مسترد کر دیا۔

ثانیاً انتخابات کے موقع پر جماعت اسلامی نے ایک مخصوص طریق کار اختیار کیا جو جدید جمہوریت کی تاریخ میں واقعتاً انوکھے اور نرالے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس طریق کار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں امیدواری اور پارٹی سسٹم کو طریقِ انتخاب کے امہات الخبائث قرار دے کر ترک کر دیا گیا۔ امیدواری کے خلاف انتہائی شدت کے ساتھ یہ کہا گیا کہ یہ سراسر حرام ہے اور اس کے جواز کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور جب معترضین نے اس شدت پر ٹوکا اور قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ سے چند شواہد ایسے پیش کیے جن سے کسی درجے میں اس کے جواز کی جانب اشارہ ملتا تھا تو ان میں سے ایک ایک کا مسکت جواب دیا گیا اور قطعیت کے ساتھ طے کر دیا گیا کہ اسلام میں امیدواری کے لیے کوئی جگہ موجود نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد")

اسی طرح پارٹی سسٹم کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ بھی دراصل اجتماعی پیمانے پر امیدواری ہی کی ایک صورت ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں دوچند بلکہ سہ چند ہو جاتی ہیں جو امیدواری سے پیدا ہوتی ہیں۔

جماعت کے "قطعی فیصلے" کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"رسولِ برحق کے یہ ارشادات [کلہ] بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے جن کی سچائی پر عقل عام گواہی دے رہی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق

کلہ احادیث کی تفصیل "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" نامی پمفلٹ میں ملاحظہ ہو۔

انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی، نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لیے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے، اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔"

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد)

امیدواری اور پارٹی سسٹم کو حرام قرار دے کر جماعت اسلامی نے جو طریقِ انتخاب ایک "صالح قیادت" کو برسرکار لانے کے لئے اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ جماعت اولاً ان حلقہ ہائے نیابت کو اپنی جدوجہد کے لئے منتخب کرے گی جن میں پہلے ہی سے اس کا اثر و نفوذ موجود ہے اور جہاں اس کے امکانات روشن ہیں کہ اگر محنت کی جائے تو کامیابی کی صورت پیدا ہو جائے۔ پھر ان حلقوں کے ووٹروں سے رابطہ قائم کیا جائے گا اور ان کے سامنے جماعت اپنے مقاصد کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے گی۔ پھر جو ووٹر جماعت کے مقاصد سے اتفاق کرلیں گے ان پر مشتمل انتخابی پنچایتیں بنائی جائیں گی۔ ہر ووٹر جو جماعت کی انتخابی جدوجہد سے متفق ہو یہ عہد نامہ پُر کرے گا:

"اسلامی حکومت اور صالح قیادت چاہنے والے

ووٹر کا عہد نامہ

میں ایک مسلمان پاکستانی ووٹر ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ جو حکومت خدا کی شریعت پر قائم ہو اور جس کا انتظام خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہو صرف

اسی کے ہاتھوں سے بندوں کو انصاف اور چین نصیب ہو سکتا ہے' اس لیے میں اپنے ملک میں ایسی ہی حکومت چاہتا ہوں۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اچھی اور بری حکومت قائم ہونے میں میرے ووٹ کا بھی حصہ ہے۔ میں اچھے لوگوں کو ووٹ دوں گا تو اچھی حکومت قائم ہوگی اور اس کا اجر دنیا و آخرت میں مجھے بھی ملے گا۔ اور اگر میں نے برے لوگوں کو ووٹ دیا تو بری حکومت قائم ہوگی اور اس سے صرف دنیا ہی میں مجھے اور دوسرے بندگان خدا کو تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ آخرت میں بھی اس کی برائیاں میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

لہٰذا میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ

۱۔ میں ووٹ دینے میں ذاتی فائدے اور نقصان کا یا اپنی ذات اور برادری کے تعلقات کا لحاظ نہ کروں گا۔

۲۔ میں صرف اس شخص کو ووٹ دوں گا جو اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں خدا اور رسول کے احکام کا پابند ہو' جو اپنے لین دین میں ایماندار اور اپنے معاملات میں کھرا ہو' جو اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔

۳۔ میں کسی ایسے شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو خود امیدوار بن کر کھڑا ہو اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔

۴۔ اگر مجھے کوئی نیک آدمی ووٹ دینے کے لیے نہ ملے گا تو میں سرے سے ووٹ ہی نہیں دوں گا۔

خدا مجھے اس عہد کو پورا کرنے کی توفیق دے' آمین"۔(ایضا)

اس عہد نامے کو پورا کرنے والے رائے دہندگان کو ابتدائی اور ثانوی پنچایتوں کی شکل میں منظم کیا جائے گا اور پھر یہ پنچایتیں اپنے حلقے میں سے ایک "صالح نمائندہ" منتخب کریں گی۔ اس "صالح نمائندے" کی حسب ذیل "نشانیاں" جماعت نے

"صالح نمائندے کی نشانیاں

اسلامی حکومت کو چلانے کے لئے آدمی میں یہ چار شرطیں پائی جانی ضروری ہیں :

اول : یہ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں اسلام کا سچا پیرو ہو' وہ خدا کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ادا کرتا ہو' وہ کھلے کھلے گناہوں کا مرتکب نہ ہو' اس کے گھر میں خدا کے قوانین علانیہ نہ توڑے جاتے ہوں۔

دوم : یہ کہ لوگوں نے اپنے تجربے میں اس کو ایک سچا' ایماندار اور کھرا آدمی پایا ہو۔ اس کی بستی کے عام لوگ اس بات کے گواہ ہوں کہ وہ ایک نیک انسان ہے۔ وہ جھوٹا اور بد معاملہ آدمی نہ ہو' وہ حرام خور' ظالم اور دوسروں کا حق مارنے والا نہ ہو' وہ رشوتیں کھانے اور کھلانے والا نہ ہو۔ اس کا دامن لوٹ مار سے' ناجائز الاٹمنٹوں سے اور بلیک مارکیٹنگ سے پاک ہو۔

سوم : یہ کہ وہ دین اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑا عالم فاضل اور کسی دینی مدرسہ کا سند یافتہ ہو۔ لیکن بہرحال اسلام کے اصولوں سے اس کا واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ جب تک وہ اسلام کو جانے گا نہیں' آخر وہ ایک اسلامی نظام حکومت چلائے گا کیسے؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو کیونکہ اس کے بغیر وہ آخر ان سیاسی' معاشی' تمدنی' تعلیمی' قانونی اور انتظامی مسائل کو کیسے سمجھے گا' جن پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کرنا ہے؟

چہارم : یہ کہ وہ جاہ و طلب اور عہدے کا حریص نہ ہو۔ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں نہ آئے جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ اسمبلی میں جانے کے لئے خود کوشاں ہے۔"

(جماعت اسلامی کی انتخابی جد و جہد)

اور پھر یہ تصریح کی کہ :

"اس طریقے سے جو شخص بھی چھانٹا جائے گا اسے حلقہ انتخاب کے عوام کی طرف سے کھڑا کیا جائے گا۔ وہ شخص خواہ جماعت اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو' یہ

جماعت اسی کی تائید کرے گی۔ اس کو اپنا زرِ ضمانت خود ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی' حلقہ انتخاب کے عام لوگ اس کی طرف سے ادا کریں گے۔ وہ انتخاب کی مہم میں ایک پیسہ اپنی جیب سے خرچ نہ کرے گا' سارا خرچ حلقہ کے لوگ کریں گے۔ وہ اپنی تعریف کے گن آپ نہ گاتا پھرے گا اور نہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے ایجنٹ چھوڑے گا' اس کے اوصاف وہ لوگ بیان کریں گے جنہوں نے اسے کھڑا کیا ہوگا اور وہی اس کے حق میں عام رائے دہندوں کی رائے ہموار کریں گے۔ اس کی ذات پر اگر کیچڑ اچھالی جائے گی تو اسے صاف کرنے کی زحمت وہ خود نہ اٹھائے گا' یہ فرض اس کی طرف سے دوسرے لوگ انجام دیں گے۔ اس کو یہ حق تو ضرور ہوگا کہ کسی دوسرے حلقے میں' کسی دوسرے مردِ صالح کی تائید کے لیے جا کر انتخابی جدوجہد کرے' مگر خود اپنے حلقے میں اپنے لیے وہ کوئی جدوجہد کرنے کا حقدار نہ ہوگا۔ اپنے حلقے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ اسے کرنا ہوگا وہ صرف یہ کہ اگر حلقے کے عام لوگ اس کو دیکھنا اور اس کے خیالات سننا چاہیں گے' تو وہ ان کے جلسوں میں آئے گا اور ان کو موقع دے گا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھیں اور ہر پہلو سے پرکھ لیں"۔(ایضاً)

ان اصول و ضوابط کے مطابق انتخابات میں حصہ لیا گیا---اور جماعت اسلامی کی پوری قوت کو ملک کے گوشے گوشے سے جمع کر کے پنجاب کے انتخابی میدان میں لے آیا گیا۔

● اس انتخاب میں حصہ لینے سے قبل اس کے بارے میں جو توقعات جماعت کے اکابرین کو تھیں' ان کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس سے جماعت اسلامی کے قائدین کی ملکی حالات اور معاشرے کی کیفیات کے بارے میں آراء کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کے بارے میں سنا گیا کہ وہ کم و بیش تیس سیٹوں پر کامیابی کا "یقین" رکھتے تھے اور مولانا اصلاحی صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک موقع پر ذرا تاریک پہلو پر نگاہ

رکھنے والے ایک شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا "آپ اتنے مایوس ہوئے جا رہے ہیں حالانکہ ہم تو ایک کولیشن وزارت کی توقع رکھتے ہیں!"۔۔۔ یہ اس جماعت کے دو انتہائی چوٹی کے لیڈروں کی توقعات تھیں۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں قراردادِ مقاصد کی "شاندار فتح" کے بعد سے جماعت کے قائدین کو اپنے اور جماعت کے اثرات کے بارے میں بالکل غلط اندازے قائم کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں جماعت کے اکابرین اور عام کارکنوں میں یہ احساس عام تھا کہ بس میدان مار لیا۔۔۔ اور اسلامی نظام قائم ہوا کہ ہوا!۔۔۔ (بلکہ حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھا جاتا تھا کہ مولانا اصلاحی صاحب کے بیان کردہ "دعوتِ اسلامی کے مراحل" بیچ میں سے کہاں غائب ہو گئے۔ یہ تحریک تو ان مراحل سے گزرے بغیر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے!) [۱۵]

حیرت ہوتی ہے کہ وہی مولانا مودودی جو چند ہی سال پہلے اس قوم کا صحیح صحیح تجزیہ کر چکے تھے اور جنہوں نے اس کی ایک ایک خامی اور ایک ایک برائی کو پوری وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کیا تھا' اب اسی قوم کے بارے میں ان خوش فہمیوں میں کس طرح مبتلا ہو گئے!

پھر اس سے قبل صحیح تجزیہ نہ ہوا ہوتا' تب بھی یہ بات تو سیاسیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی سمجھ میں بھی آ جانی چاہیے تھی کہ پاکستان میں ایک مخصوص معاشی اور اقتصادی نظام قائم ہے۔ یہاں کے عوام و خواص کی ایک غالب اکثریت کسی اصولِ حیات سے نا آشنا محض مفاد اور اندھی منفعت پرستی کی زندگیاں بسر کر رہی ہے۔ برادریوں اور خاندانوں کے جال نے لوگوں کو باندھ رکھا ہے۔ مزارع زمیندار اور مزدور کارخانہ دار کی مرضی کے خلاف حرکت تک نہیں کر سکتا۔۔۔ تو اس معاشرے میں ایک صالح قیادت آخر کون سے معجزے کے تحت برپا ہو سکتی ہے!

---

[۱۵] ملاحظہ ہو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" کا باب "دعوتِ اسلامی کے مراحل"۔

اور جب ہوا میں بنے ہوئے یہ محل اور مٹی کے یہ گھروندے زمین پر آ رہے اور تیس کی بجائے جماعت کے طریق کار کے تحت ایک شخص بھی کامیاب نہ ہو سکا[۳۱] تو پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ اپنی "اصول پرستی" ہی کو "عظیم الشان فتح" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا!

اور یہ بہرحال واقعہ ہے کہ جہاں تک میری ذاتی معلومات کا تعلق ہے، جس اصول پرستی کا مظاہرہ جماعت اسلامی نے ان انتخابات میں حصہ لیتے ہوئے کیا اس کی مثال جدید جمہوریت کی تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔ جماعت نے جو بھی طریق کار ابتداء میں وضع کر لیا تھا---- قطع نظر اس سے کہ وہ غلط تھا یا صحیح ----اور اس میں خامیاں تھیں تو کیا---- بہرحال آخر دم تک اس کی پوری پابندی کی اور اس بات کو برداشت کر لیا کہ ایک بھی نمائندہ کامیاب نہ ہو لیکن اسے گوارا نہ کیا کہ اپنی اصول پسندی پر کوئی آنچ آئے! ابتدا سے لے کر انتہا تک جماعت ہر قسم کی سودا بازی سے پاک رہی اور کسی ایسے غلط ذریعے کو اس نے بالکل استعمال نہ کیا جس سے کامیابی کے امکانات تو روشن ہوتے ہوں لیکن کوئی اصول کسی طرح مجروح ہوتا ہو۔

یہ اصول پسندی جس کا جماعت اسلامی نے اس موقع پر مظاہرہ کیا جماعت کے اس دورِ ثانی میں بڑی نمایاں حیثیت سے سامنے آتی ہے، لیکن یہ اصل میں جماعت کے دورِ اول کی خصوصیات کی "باقیات الصالحات" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک جماعت کے دورِ اول کی وہ خصوصیات جن کا میں نے دور اول کا تذکرہ کرتے ہوئے چھٹی اور ساتویں شق میں تفصیلاً ذکر کیا ہے، شدت اور پوری آن بان کے ساتھ قائم تھیں اور انہی کی ایک جھلک انتخابات پنجاب کے موقع پر ظاہر شدہ اس اصول پرستی میں نظر آتی ہے.....

---

[۳۱] واضح رہے کہ مولوی محی الدین لکھوی باقاعدہ جماعت کے اختیار کردہ طریق کار کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے، بلکہ وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر منتخب ہوئے اور ان کو اپنے "صالح نمائندے" کے معیار پر پورا پا کر جماعت نے Adopt کر لیا تھا!

جوں جوں وقت گزرا اور دورِ ثانی کے طریق کار کے نتائج رونما ہونے شروع ہوئے، رنگِ قدیم پھیکا پڑتا چلا گیا اور وہ رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا جو اس دورِ جدید کے طریق کار کا فطری اور منطقی نتیجہ تھا۔ اور آج ---- اُس وقت کی اصول پرستی کو ایک حماقت قرار دینے والے بھی جماعت میں پائے جاتے ہیں بلکہ اس کے اہم مناصب پر فائز ہیں۔ آئندہ انتخابات کے بارے میں جو طریق کار اِس وقت ذہنوں میں زیرِ غور ہے وہ بالکل اس طریق کار کا ہیولیٰ ہے جسے ایک بے اصول اور محض اقتدار پرست جماعت ہی اختیار کر سکتی ہے۔ (اس کی تفصیل آئندہ کسی موقع پر عرض کروں گا) [۲۷]

۵۱ء میں جب جماعت اسلامی اپنی اصول پسندی کا عملی مظاہرہ کر رہی تھی تو قدرت مسکرا رہی تھی کہ دَورِ اول کے ثمرات سے چند روز اور متمتع ہو لو۔ اب جس فصل کے بیج بو چکے ہو اور جس کی آبیاری مسلسل کر رہے ہو، وہ دن دُور نہیں کہ وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی بن کر تمہارے سامنے آ جائے۔ اُس وقت آج کی یہ اصول پسندی

---

[۲۷] اس تفصیل کو بیان کرنے کا موقع تو پیشِ نظر تحریر میں نہ آیا لیکن بعد کے حالات میں جماعت اسلامی نے اپنے مخصوص طریق انتخاب کی تمام شقوں کو ایک ایک کر کے جس طرح ترک کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ پہلے پارٹی سسٹم اور پارٹی ٹکٹ کو "حلال" کیا گیا ---! --- پھر امیدواری کو "مسلمان" کیا گیا --- غرض ع "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز" کے سب سے بڑے داعی کو عملاً ع "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز" پر کاربند ہونا پڑا ۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ تمام تبدیلیاں جو جماعت اسلامی نے طریق انتخاب میں اختیار کیں انتخابات پنجاب کی "شکست فاش" کے فوراً بعد ذہنوں ہی میں نہیں اس کے راہنماؤں کی گفتگوؤں تک میں گردش کرنے لگی تھیں، لیکن اس وقت تو اپنی "اصول پرستی" کو "فتح مبین" قرار دے کر اطمینان حاصل کر لیا گیا اور بعد میں رفتہ رفتہ ان اصولوں کو بقدرِ ضرورت "حالات" کی قربان گاہ پر ذبح کیا جاتا رہا! ----

ایک بھولی بسری داستان معلوم ہوگی اور ممکن ہے کہ "حماقت" نظر آئے!!!-----

اپنی عملی جدوجہد کی دوسری شق یعنی "انقلابِ قیادت" کی مہم میں انتخاباتِ پنجاب جماعت اسلامی کی کم از کم اتنی بڑی ناکامی ضرور تھی جتنی بڑی کامیابی شق اول یعنی دستوری جدوجہد کے سلسلہ میں قراردادِ مقاصد کو سمجھا گیا تھا اور یہ جماعت کے لیے ایک زریں موقع تھا کہ وہ ان حتائج کو دیکھ کر جو انتخابات سے برآمد ہوئے اپنے غلط اندازوں کی تصحیح کر لیتی اور اگر کسی وجہ سے اب تک حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو گئی تھی تو اب جب کہ صحیح صورت حال کھل کر سامنے آگئی تھی' غلطی کی اصلاح کر لی جاتی۔ چنانچہ اس زمانے میں جماعت میں عارضی طور پر اس طریق کار سے بددلی اور مایوسی واقعتاً پیدا ہوئی بھی تھی جو انقلابِ قیادت کے لیے کار آمد سمجھ کر اختیار کیا گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اپریل ۵۱ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے باقاعدہ اس مسئلے پر غور و خوض کیا کہ "پنجاب کے حالیہ انتخابات کے حتائج کو دیکھتے ہوئے آیا الیکشن کے ذریعے سے یہاں اصلاح ممکن ہے؟"----- شوریٰ نے بہت "غور و خوض" کے بعد یہ رائے قائم کی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے' بلکہ اس طریق کار کو جاری رکھنے کے لیے خود ان انتخابات کے کوائف ہی میں دلائل موجود ہیں!

اس سلسلے میں "رودادِ مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان منعقدہ ۱۵ تا ۱۹/ اپریل ۵۱ء" کے وہ صفحات (۵ تا ۱۰) پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں اس مسئلے پر مجلس شوریٰ نے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس تجزیے میں ایک طرف اعداد و شمار کے ذریعے کارکنانِ جماعت کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ اگرچہ ہم ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے تاہم اتنے لوگوں نے ووٹر کا عہد نامہ پُر کیا' انہوں نے ہمیں ووٹ دیئے..... وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف اس معاشرے اور اس کی انتظامی مشینری کی ان تمام خرابیوں کو جو اس کا جزوِ لاینفک ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں' ایسے بیان کیا گیا جیسے یہ کوئی بلائے ناگہانی تھی جو کہیں باہر سے نازل ہو گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ہماری کامیابی یقینی تھی!

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

بہرحال اس طریق کار کے بارے میں جو تھوڑی بہت خلش جماعت کے کارکنوں میں پیدا ہو گئی تھی، اسے شوریٰ کے اس تجزیے نے ختم کر دیا اور ان دونوں نکات پر جماعت اسلامی پاکستان کی جدوجہد جاری رہی ---- اور یہ قافلہ ذرا سستا کر پھر اسی راہ پر گامزن ہو گیا۔ ع ---- "یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!"

بعد کے مراحل

بعد کے مراحل میں بھی اگرچہ جماعت کی اصل مساعی انہیں دو نکات پر مر رہیں لیکن کہیں کہیں کچھ اور کاموں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ رفاہِ عامہ کے کام، اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں، سعیٔ تحفظِ اخلاقِ عامہ، تعلیمی سکیمیں ---- وغیرہ۔ لیکن یہ کوششیں بس ضمنی سی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کسی کے سلسلے میں اگر کام ہوا بھی تو بس ان ہی کے سلسلے میں کہ جو ان دو نکات میں Fit بیٹھتے ہوں اور اسی قدر کہ جس قدر ان دو نکات کے نقشہ کار میں ان کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اس کے علاوہ یہ کام ہو بھی صرف اسی زمانے میں سکے ہیں، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں صرف اسی زمانہ میں ان کا خیال پیش کیا گیا ہے (اس لیے کہ عملاً کام تو کچھ ہوا ہی نہیں) جبکہ مہماتی کام کے ختم ہونے کی وجہ سے "کام کا خلا" محسوس کیا گیا۔ مثلاً:

۱۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد کے "خلا" کے زمانے میں "رودادِ مجلس شوریٰ" میں پیش کردہ اصلاحی، تعلیمی اور رفاہی کاموں کا پروگرام ---- جس کو شروع ہونے سے قبل ہی انتخابات کی مہم نے ختم کر دیا ----

۲۔ دستوری مہم نمبر ۲ کے ختم ہو جانے کے بعد "انجمن تحفظِ اخلاقِ عامہ" کی قسم کے کام کا پروگرام ---- جسے اس کی کاغذی تکمیل سے بھی قبل اینٹی قادیانی تحریک اور اس سے پیدا شدہ حالات نے ختم کر دیا ---- میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ کہیں

کہیں منتشر مساعی کچھ اور بھی نظر آتی ہیں لیکن اصل توجہ بعد کے مراحل میں بھی انہی دو نکات پر مرکوز رہی۔

بعد کے ادوار میں ان دونوں شقوں پر کام کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

دستوری جدّوجہد

اس جدوجہد کی تاریخ میں ۵۲ء ایک یادگار سال ہے۔ اس سال کے اوائل میں مولانا مودودی صاحب نے کراچی کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کرکے دستورِ اسلامی کا ہشت نکاتی مطالبہ پیش کیا جو بعد میں (احرار کی قیادت میں انٹی قادیانی مطالبات کے شدت اختیار کر جانے کے باعث) نو نکاتی بنا دیا گیا۔ مسلسل کئی ماہ دستوری مہم پورے زور شور کے ساتھ چلتی رہی اور اواخر ۵۲ء میں جو دو دستوری ہفتے منائے گئے وہ اس جدوجہد کی Climax کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دستوری مہم ایک مہم ہونے کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ ابتداء میں اس بات کا خطرہ تھا کہ اس مرتبہ پھر پہلے ہی کی طرح کی سفارشات سامنے لائی جا رہی ہیں لیکن "پہلے دستوری ہفتے" نے خواجہ ناظم الدین صاحب اور ان کی وزارت کو مجبور کر دیا کہ جو سفارشات مرتب ہو چکی تھیں، ان میں ترامیم کی غرض سے دستوریہ کا اجلاس ایک ماہ مؤخر کر دیا جائے۔ اور پھر "دوسرے دستوری ہفتے" نے جس کے دوران غالباً پہلی مرتبہ جماعت نے انتہائی کامیاب جلوس بھی نکالے، رہی سہی کسر پوری کر دی اور دستور میں اسلامی مطالبات کو کسی حد تک تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سفارشات جو غالباً اپنے اسلامی ہونے کے لحاظ سے خاصی قابلِ قبول تھیں، دسمبر ۵۲ء میں دستوریہ کے اجلاس میں پیش ہوئیں۔

اس مہم کے دوران کے کام اور ان سفارشات کے پیش ہونے میں کن کن عناصر کو کس کس حد تک دخل تھا، اس کے ضمن میں دو باتیں بالکل واضح ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ خود دستوریہ میں اچھا خاصا عنصر "مخلصین مسلم لیگ" کا ابھی تک موجود تھا۔ مثلاً خواجہ ناظم الدین صاحب، سردار عبد الرب نشتر صاحب وغیرہم۔

لہ سورۃ التحریم آیت ۸: "اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ۔"

۲۔ دوم یہ کہ اگرچہ اس سے قبل بھی علماء کی طرف سے دستوری مہمات میں کسی قدر تائید ہوتی رہی تھی لیکن اس سال جمیعت علمائے اسلام کا وہ گروہ جو کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے رفقاء اور لاہور میں مولانا عبدالحلیم قاسمی اور مولانا داؤد غزنوی مرحوم پر مشتمل تھا‘ اس نے جماعت کا کافی ساتھ دیا بلکہ مقدم الذکر گروہ نے تو از خود حرکت میں آکر بہت قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ پاکستان بھر کی دینی جماعتوں اور فرقوں کے نمائندہ علماء کا جو اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اور جس میں دستورِ اسلامی کے متفقہ اساسی اصول پیش کیے گئے (یاد رہے کہ یہ دستاویز دستور کی مہم میں انتہائی ممد و معاون ثابت ہوئی تھی) وہ انہی حضرات (بشمول مولانا ظفر احمد انصاری صاحب) کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا---- سفارشات کے پیش ہو جانے کے بعد جنوری ۵۳ء میں انہی علماء کا ایک اور اجلاس ہوا جس نے سفارشات پر اپنی آراء پیش کیں!

۵۳ء اور ۵۴ء کے دو سال جن ہنگاموں میں گزرے ہیں انکی تفصیل لاحاصل ہے۔ ان کا جو نتیجہ "دستوری مہم" پر مترتب ہوا‘ وہ یہ تھا کہ جو کام ایک طویل عرصے میں کیا گیا تھا‘ وہ پھر گویا ایک دم کالعدم ہو گیا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کے بعد مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں "درآمد شدہ وزیر اعظم" محمد علی بوگرا تشریف لائے اور انہوں نے خالص Secular قسم کے دستور کے نفاذ کے عزائم کا اظہار کیا۔ یہ زمانہ جماعت اسلامی پر انتہائی کٹھن تھا لیکن اس کے باوجود اس زخم خوردہ حالت میں بھی جماعت نے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا اور پھر مطالبات کی مہم شروع ہو گئی---- آخر کار ستمبر ۵۴ء میں پھر کامیابی کی صورت نظر آئی اور دستوری سفارشات میں "اسلامی دفعات" برقرار رکھ لی گئیں----

اس کے بعد ایک اور بم پھٹا---- اور دستور یہ ہی توڑ دی گئی۔ گویا کہ کیا کرایا کام ایک مرتبہ پھر نیست و نابود ہو گیا۔ یہ پاکستان کی دستوری تاریخ میں انتہائی شدید انتشار اور تعطل کا دور تھا۔ اس وقت اسلام اور دستورِ اسلامی تو دُور رہے‘ اس ملک

میں جمہوریت کا مستقبل بھی تاریک نظر آ رہا تھا اور سخت خدشہ تھا کہ کہیں ایک فوجی آمریت ملک پر مسلط نہ کر دی جائے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ تربیت یافتہ رائے عامہ اور منظم عوامی قوت' اگر ان کا وجود پاکستان میں واقعی پایا جاتا تھا تو وہ بر سر کار آتیں اور ان خطرات کا مقابلہ کرتیں' لیکن ہر سوچنے سمجھنے والا شخص جانتا ہے کہ اس موقع پر ثابت ہوا کہ ان دونوں کا پاکستان میں معدوم ہونے کی حد تک فقدان ہے---- اگر "اوپر کے لوگ" اس موقع پر فوجی آمریت قائم کرنے پر اتر آتے تو پاکستان میں کوئی قوت ایسی موجود نہیں تھی جو میدان میں آ کر انہیں للکار سکتی۔ خصوصاً جماعت اسلامی کے لیے تو اس بات کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ وہ فوجی آمریت کے قیام کو Resist کر سکتی۔

اب اسے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کا فضل و کرم کہہ لیجیے' یا اس بات کا اثر کہ کچھ اور ہی عوامل نے پاکستان کے حکمرانوں کو اس سے باز رکھا اور کسی نہ کسی طرح فوجی آمریت کا خطرہ ٹل گیا۔

لیکن دستوری تعطل اب بھی موجود تھا---- "نفاذِ دستور بذریعہ آرڈیننس" کی تجویز سامنے آئی اور واپس لے لی گئی۔ "نامزد دستوریہ" کا خطرہ سامنے آیا اور ٹل گیا---- اور بالآخر ایک منتخب دستوریہ عالمِ وجود میں آئی اور اس طرح ایک اور "دستوری مہم" کی ضرورت سامنے آ گئی۔

لیکن اب ایک طرف جماعت اسلامی کے ہاتھ پاؤں (یعنی اس کے کارکن) شل ہو چکے تھے اور اس کے قویٰ جواب دیتے محسوس ہو رہے تھے اور دوسری طرف عوام بھی کسی دستوری مہم کے لیے تیار نہ تھے۔

اولاً عوام ایک طویل عرصے تک "دستخط" کرتے' خطوط لکھتے اور تاریں بھیجتے تھک چکے تھے' اور ان میں کچھ تو مایوسی غالب آ گئی تھی اور کچھ خاص طور پر ان ذرائع پر سے ان کا اعتماد کم ہو گیا تھا۔

ثانیاً جماعت کے کارکن بھی تھک چکے تھے۔ ایک تو ایک ہی طریقے پر کام کرتے کرتے اب کیفیت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ وہی طریقے جو پہلے جاذبِ نظر تھے' اب انکی جاذبیت میں کمی واقع ہو گئی تھی--- دوسرے' ایک طویل عرصے تک ہماہمی کاموں میں مسلسل انہماک کے باعث اب ان کی کیفیت اس مشین کی سی ہو گئی تھی جو مسلسل بغیر Service کے استعمال کی جائے۔ بوسیدگی کے آثار اب بالکل نمایاں تھے۔ "سمع و طاعت" کے پیچ بھی اب قدرے ڈھیلے تھے اور جوشِ کار اور جذبۂ ایثار کا تیل بھی اب خشک ہو چکا تھا--- تیسرے اس "دَورِ ثانی" کی "سیاسیت" بھی رنگ لا رہی تھی۔ دَورِ اول کے اثرات کا بچا کھچا اثاثہ جس سے اب تک کام چل رہا تھا اب ختم ہو رہا تھا اور نئے طریق کار اور نوعیتِ جماعت کے انقلاب کے فطری اثرات اب ظاہر ہو رہے تھے---- لہٰذا اس مرتبہ "دستوری مہم" کے لیے عوام کی بجائے دستوریہ کے ارکان کی طرف رجوع کیا گیا اور چونکہ اب تمام تر توقعات بس انہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں لہٰذا اسارا زور انہی پر صرف کر دیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر جماعت اسلامی نے ایک بہت بڑی بے اصولی کا ارتکاب کیا۔ میری مراد یہاں میاں عبدالباری صاحب کے انتخاب کے لیے کی گئی اس دوڑ دھوپ سے ہے' جو جماعت کے مرکزی سٹاف کے لوگوں نے کی ۔ میاں صاحب کی انتخابی مہم میں جماعت کے تعاون سے ایک طرف امیدواری اور پارٹی سسٹم کو سندِ جواز عطا ہو گئی اور دوسری طرف یہ اصول بھی مجروح ہو گیا کہ جو لوگ مقصد' نصب العین اور طریق کار میں جماعت سے اختلاف رکھتے ہوں' جماعت ان کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتی۔ جماعت کے اجتماعِ ارکان منعقدہ اجتماع سالانہ ۵۵ء میں جب اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو قیمِ جماعت جناب طفیل محمد صاحب نے انتہائی اطمینان کے ساتھ یہ "قاعدہ کلیہ" ارشاد فرما دیا کہ "اصول کاغذ پر کچھ اور ہوتے ہیں اور جب عمل کی دنیا میں آتے ہیں تو کچھ اور ہو جاتے ہیں---" دیکھنے والوں کو ان الفاظ کے دوش پر جماعت اسلامی کی اصول پسندی (جس کا مظاہرہ بڑے طمطراق کے ساتھ انتخاباتِ پنجاب ۵۱ء

میں کیا گیا تھا) کا جنازہ جاتا نظر آرہا تھا۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے!

آج جماعت اسلامی کے انتہائی ذمہ دار افراد کے منہ سے وہ کلمات نکل رہے تھے جن کے خلاف بولتے اور لکھتے جماعت کو عمر گزر گئی تھی اور خود جماعت کا جو حال ہو چکا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ اس بھرے اجتماع میں جہاں جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان کی اکثریت موجود تھی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو کھڑے ہو کر کہنے والے کی زبان نہ پکڑ سکتا' تردید تو کر دیتا!----

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے؟
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!

بہرحال ----- یہ آخری مہم جس طرح بھی چل سکی چلائی گئی ---- اور کچھ اس کے اور کچھ دوسرے عوامل کے اثرات کی بنا پر چودھری محمد علی صاحب کے ہاتھوں وہ دستور بن کر نافذ ہو گیا جسے جماعت اسلامی نے "اسلامی دستور کی کم از کم لازمی شرائط پورا کر دینے والے دستور" کی حیثیت سے قبول کر لیا اور اس طرح جماعت کے پروگرام کی شق اول پر نو سالہ مساعی کا "نتیجہ" نکل آیا۔ اس نتیجے کا جائزہ میں بعد میں لوں گا۔

انقلاب قیادت

انقلاب قیادت کے لیے جماعت اسلامی کے اختیار کردہ طریق کار کے بنیادی فلسفے کا اولین سراغ اس تقریر میں ملتا ہے جو ۴۷ء میں مدراس میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد عملی جدوجہد کا آغاز مسلم لیگی قیادت پر اس شدید تنقید سے کیا گیا جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس تنقید کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مسلم لیگی قیادت نے قومی جنگ میں اناڑیوں کی طرح حصہ لیا اور اس طرح یہ ان تمام مصائب و آلام کی ذمہ دار ہے

جو تقسیم کے وقت مسلمانوں پر نازل ہوئے اور یہ قیادت اس لائق نہیں ہے کہ آئندہ کے لیے اسے قومی زندگی کی گاڑی کا ڈرائیور بنادیا جائے۔ دوسرے یہ کہ --- ان کی زندگیاں سراسر مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اور اسی رنگ میں یہ پورے پاکستان کو رنگ دینا چاہتے ہیں --- اس ابتدائی کام کے بعد جماعت ایک فریق کی حیثیت سے انتخاباتِ پنجاب کے Test match میں شریک ہوئی اور بری طرح شکست کھاکر پسپا ہوئی۔ بعد کے مراحل میں بھی "تنقید" کا یہی طریق کار اختیار کیا گیا لیکن اس میں اس شکست کے باعث انتہائی تیزی، تندی اور تلخی --- جو بعض اوقات تو بے رحمی کی حد تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے --- پیدا ہو گئی۔

اب "تنقید" دو صورتوں میں ہو رہی تھی ---

● "برسرِ اقتدار گروہ" کے لوگوں کی انفرادی زندگیوں کے نقائص اور عیوب کی تشہیر اور ان کی ان سرگرمیوں کی مذمت جو وہ پاکستانی معاشرت کو بالکل مغربی طرز پر ڈھالنے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

یہ کام جس طرح پر ہوا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ---- ہمارے "ادبِ ثقیل" میں سے اولاً مولانا مودودی صاحب کی تقریر "مطالبۂ نظامِ اسلامی" کا وہ حصہ جو اس سے بحث کرتا ہے، پھر مولانا امین احسن صاحب کی ۵۰ء والی تقریر "ہمیں کس مقام پر لا کھڑا کیا گیا ہے!" --- اور "پاکستانی عورت دوراہے پر" کا مطالعہ مفید ہے --- اور "ادبِ لطیف" میں سے نعیم صدیقی صاحب کے مزاحیہ مضامین (جیسے "وزیر اعظم نے نمازِ جمعہ ادا کی" -- اور "----- نے روزہ رکھا" --- وغیرہ) جناب اسعد گیلانی صاحب کے تیز و تند طنزیہ مضامین (جن کا دوسرا نام "جہانِ نو" ہے) اور جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے "تیر و نشتر" اور "تکلف بر طرف" کا مطالعہ مفید ہے ----!

اس پورے سلسلہ تنقید میں چند باتیں بالکل نمایاں ہیں:

ایک -- یہ کہ ان میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی "جذبۂ اصلاح" ---- اور "ہمدردانہ خیر خواہی" کا وجود نہیں ملتا۔ یہ ایک تیز و تند طنز و مزاح کا سرمایہ ہے جو ادبی اعتبار سے

چاہے کتنا ہی وقیع ہو لیکن ان جذبات کے لحاظ سے قطعی طور پر تہی دامن ہے جس کی تعلیم ہمیں اسلام دیتا ہے۔ (حیرت ہوتی ہے کہ وہی نعیم صدیقی صاحب جو "چراغِ راہ" کے اوراق میں اس طرح کے مضامین کے انبار لگاتے ہیں' جب "ترجمان القرآن" کے اشارات تحریر کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کے قلم سے "تنقید" کے موضوع پر اسلامی تعلیمات کا ایسا جامع مرقع نکلتا ہے کہ جسے دیکھ کر بے اختیار صاحبِ مضمون کے حق میں دعائے خیر نکلتی ہے)

دوسرے--- یہ کہ پورے معاشرے کی خرابیوں کا اندراج "برسرِ اقتدار گروہ" کے نامہ اعمال میں کردیا جاتا ہے ع

" پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق "

کی طرح اگر کہیں خدا کے ہاں یہ مضامین جو برسرِ اقتدار گروہ کی شان میں لکھے گئے ہیں' ان کے محاسبے کی بنا قرار دے دیئے جائیں تو ان کو جہنم کا سب سے نچلا حصہ بھی قبول کرنے سے انکار کردے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ طرزِ معاشرت' یہ اخلاق' یہ بے حیائی اور یہ بے پردگی اور ناچ اور گانا اور یہ رقص و سرود کوئی ایک دن میں نہ پیدا ہو گئے تھے' نہ کیے جاسکتے تھے' یہ ایک صدی کی انگریز کی غلامی اور صدیوں کے انحطاط کا نتیجہ تھے اور قوم کے اس پورے طبقہ میں موجود تھے جو پڑھا لکھا--- تعلیم یافتہ--- مختلف محکموں (فوجی اور سول) کی جان اور پاکستان کی انتظامی مشینری کی روحِ رواں تھا۔ اب کیا آپ "برسرِ اقتدار گروہ" سے مراد ان سب کو لیتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو کیا آپ کو اس بات کا امکان بھی نظر آسکتا تھا کہ اس کو "انتخابات" کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے--- اور اگر ایسا نہیں تھا تو پھر ان سب کے گناہوں کا بوجھ "برسرِ اقتدار گروہ" کے کندھوں پر کیوں ڈالا جا رہا تھا--- صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس طرزِ تنقید کے بجائے ان خرابیوں کی وجوہات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس طرح آپ کے دلوں میں ان کے لیے بے رحمی کی بجائے ہمدردی پیدا ہوتی۔ اور یہ نہ ہوتا تو کم از کم آپ ایک گروہ کو ساری خرابیوں کا

ذمہ دار تو نہ ٹھہرا دیتے!

● تنقید کا دوسرا حملہ اس طرح تھا کہ: یہ لوگ نااہل ہیں۔ پاکستان کی تمام مشکلات کی جڑ یہی ہیں اور ان میں پاکستان کے مسائل حل کرنے کی سرے سے کوئی صلاحیت اور قابلیت موجود نہیں ہے۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ضرور تھی لیکن اس کو بہت زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا اور یہ لے اس حد تک بڑھی کہ جماعت کے "ناقدین" کا یہ حال ہو گیا کہ کہیں کوئی خرابی نظر آئی---- الزام "برسرِاقتدار گروہ" پر--- کہیں کوئی نقص پیدا ہو گیا تو ذمہ داری ساری کی ساری "قیادت" کی---- اور پاکستان کی تمام مشکلات اور مصائب کی جڑ---- بس ایک قیادت کی نااہلی! حالانکہ فی الحقیقت پاکستان کے مسائل کے پیدا ہونے میں اس گروہ کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور عوامل کو بھی دخل تھا (مثلاً تقسیمِ ہند کا عجیب و غریب ڈرامہ اور نقشہ' پاکستان کے وسائل کی کمی---- وغیرہ) اور پاکستان کی مشکلات کا حل نہ ہو پانے میں اس گروہ کی نااہلی کے ساتھ ساتھ ان مسائل کی واقعی دِقّت اور شِدّت کو بھی دخل تھا---- آپ تنقید ضرور کرتے' یہ آپ کا سیاسی اور قومی حق تھا' لیکن از روئے انصاف دوسرے عوامل کے حصے کا بوجھ بھی اس گروہ کے سر منڈھ دینا تو کسی طرح صحیح نہ تھا۔ یہ بے رحمانہ تنقید مسلسل جاری رہی---- اور اس میں اس جماعت کے ادنیٰ کارکنوں سے لے کر اس کے چوٹی کے لیڈروں تک سب نے برابر کا حصہ لیا۔ اس "تنقید" کے علاوہ اس پورے عرصہ میں "انقلابِ قیادت" کے لئے کوئی اور کام ہوا ہی نہیں جس کا تذکرہ کیا جائے---- پنجاب کے Test کے بعد سرحد اور بہاولپور میں دو چھوٹے چھوٹے میچ اور ہوئے لیکن ان کے نتائج بھی وہی تھے جو پنجاب میں ظاہر ہوئے تھے---- (بلکہ اس سے بدتر----!) نتائج کا جائزہ آگے آرہا ہے!!

(ا)

نتائج اور میزانیۂ نفع و نقصان

جماعت اسلامی کی دستوری جدّوجہد کا نتیجہ دستور پاکستان کی "اسلامی دفعات" ہیں۔ان کے بارے میں جماعت اسلامی نے اظہارِ اطمینان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے ذریعے وہ کم سے کم شرائط پوری ہو گئی ہیں جو دستور پاکستان کو "اسلامی" بنانے کے لیے ناگزیر تھیں۔

قانونی حیثیت سے تو شاید یہ بات درست ہو لیکن حقیقی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دستور میں چند سطحی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس دستور کی نام نہاد اسلامیت زیادہ تر بس اوپری اور سطحی چیزوں تک محدود ہے۔ مثلاً

- یہ کہ ریاست پاکستان کا نام..... "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" ہو گا۔
- یا یہ کہ صدر مملکت کا مسلمان ہونا لازم ہو گا۔
- یا پھر چند چیزیں ہیں جو "راہنما اصولوں" میں آئی ہیں، لیکن دستور میں ان کی عملی تاثیر ہوتی ہی کیا ہے!

Operative Clauses میں لے دے کر ایک دفعہ ہے کہ جس میں "قرآن و سنت" کے خلاف قانون سازی کو ممنوع قرار دیا گیا..... لیکن اس کے لیے بھی جو Procedure طے کیا گیا ہے اس نے اسے مفلوج اور بے کار بنا کر رکھ دیا ہے!

اور یہ وہ کُل "اسلامی دفعات" ہیں جن کی رو سے دستور کو "اسلامی دستور" قرار دے کر اسے "اسلام کی فتح"..... اور "عوامی طاقتوں کی کامیابی" قرار دیا جا رہا ہے۔

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں:

ایکؔ.....یہ کہ آخر جماعت نے اسے قبول کیوں کیا؟ اور

دوسرے ---- یہ کہ آیا نو سال کی جدوجہد کا یہ ثمرہ --- اتنا وقیع ہے کہ اس کے لیے اس قدر طویل جدوجہد Justified سمجھی جا سکے اور یہ باور کیا جا سکے کہ جس طریق کار کو ۴۷ء میں اختیار کیا گیا تھا وہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور قابل اطمینان نتائج پیدا کر رہا ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے صاف نظر آتا ہے کہ جماعت نے اس دستور کو اس کے "Merits" پر نہیں بلکہ اپنی "مجبوری" کے باعث قبول کیا ہے۔ دراصل حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے اور جماعت اب اس قدر بے چارہ ہوئی جا رہی تھی کہ جو کچھ بھی مل رہا تھا اس پر قناعت کر لینا اور اسے غنیمت سمجھ لینا پڑا۔ اس مقام پر جماعت اسلامی اور اس کی قیادت پر وہ تبصرہ ٹھیک ٹھیک صادق آتا ہے جو آٹھ سال قبل مولانا مودودی صاحب نے مسلم لیگی قیادت پر کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو اقتباس بر ص ۱۲۶) جس طرح سلطان عبدالحمید خاں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ تیس سال تک دولِ یورپ کی آپس کی آویزش کے سہارے جیتے رہے اور مسلم لیگ کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ صرف انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتی رہی بالکل اسی طرح یہ واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اس پورے دَور میں برسرِاقتدار گروہ کی چپقلش اور باہمی آویزش و تصادم کے سہارے جینے کی کوشش کی' اگرچہ جماعت اس پورے دَور میں دستور کے مسئلے پر حاصل کردہ پے درپے "کامیابیوں" کو سراسر عوامی جدوجہد کا نتیجہ اور اپنی مساعی کا ماحصل قرار دیتی رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام کامیابیوں میں کہ جو جماعت کو ان لوگوں کے مقابلے میں حاصل ہوئیں' جماعت کی اپنی قوت و طاقت سے زیادہ ان کی آپس کی ناچاقیوں اور پارٹی بازیوں کو دخل ہے اس بات کا اعتراف خود جماعت کے اکابرین کی طرف سے مسرت اور اطمینان کے ان ملے جلے جذبات کی شکل میں ہوتا رہا ہے کہ جو "شیطان کی اس ٹولی" کے باہمی تنازعات پر ظاہر کیے جاتے رہے ---- اس کا مظاہرہ ایک جگہ تو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے۔ "ترجمان القرآن" بابت مئی ۵۶ء میں مولانا مودودی صاحب نے پاکستان میں

صورت حال سے جو مایوسی پیدا ہوتی جا رہی تھی اس کو دُور کرنے کے لیے چند "حقائق" بیان کیے ہیں "جنہیں نگاہ میں رکھنے سے" مولانا کی رائے میں یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید کی شعاعیں چمکنی شروع ہو جاتی ہیں"---- ان چار حقائق میں سے کہ جو اس سلسلے میں بیان ہوئے ہیں حقیقت نمبر ۳ یہ ہے کہ:

"بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسر ہے مگر دو چیزیں میسر نہیں ہیں ایک سیرت و کردار کی طاقت دوسرے اتحاد و اتفاق----"

"----حقیقت میں یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کے دلوں میں نفاق کو ڈال کر انہیں آپس میں لڑا دیا ہے خیر کی راہ اب تک بھی اسی شگاف سے نکلی ہے اور آئندہ بھی یہ شگاف جتنا وسیع ہوتا جائے گا خیر کا رستہ بھی کشادہ ہوتا چلا جائے گا"

پھر یہ بات جس طرح ان کے بارے میں صحیح تھی کہ انہوں نے اپنی طاقت بنانے کی کوئی کوشش نہ کی اور سارا انحصار صرف مدِمقابل گروہ کے اختلاف پر کیا' اسی طرح جماعت کے بارے میں بھی صحیح ہے کہ اس نے بھی دستور کے مطالبات تو پیش کیے اور اس کے لیے لوگوں سے دستخط بھی کرائے اور انگوٹھے بھی لگوائے لیکن خود ان عوام کی اخلاقی و دینی تربیت اور ان کی سیاسی تنظیم کی طرف کوئی توجہ نہ کی کہ کسی موقع پر وہ قوت کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے مطالبے کو منظور کرا سکتے۔ نہ صرف یہ کہ "عوام" میں اس پورے عرصے میں کوئی "طاقت" پیدا نہ ہو سکی بلکہ خود جماعت میں جس قدر دم خم تھا اور جتنی قوتِ کار تھی' اسے بھی نہ صرف یہ کہ بڑھایا نہ جا سکا بلکہ برقرار بھی نہ رکھا جا سکا --- چنانچہ جب اصل "تصادم" کا وقت آیا تو جس طرح ۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کا وقت آ جانے پر مسلم لیگ نے اپنے آپ کو ہوا میں کھڑے ہوئے پایا تھا' اسی طرح جماعت اسلامی نے محسوس کیا کہ نیچے سرے سے وہ قوت ہی موجود نہیں ہے جسے میدان میں لایا جا سکے۔

گزشتہ سال جب فوجی آمریت کا خطرہ سامنے آیا تھا تو جماعت نے اپنا پورا

طرح جائزہ لے لیا تھا کہ "من آنم"---- اور اس سال جب دستور اپنے آخری مراحل میں داخل ہوا تو جماعت کو جو کچھ بھی مل گیا اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرنا پڑا---- اسے رد کر کے مزید کا مطالبہ کرنے کی سکت آخر کہاں تھی؟ اس بات کو پوری طرح Appreciate کرنے کے لیے ذرا ان تقریروں کو ذہن میں مستحضر کیجئے کہ جو ۵۲ء میں "دستوری ہفتوں" کے دوران لاہور میں نعیم صدیقی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اور کراچی میں مولانا مودودی صاحب نے کی تھیں۔ ان میں "انتباہات" اور Warnings کی شدت کا تصور کیجئے اور اس خود اعتمادی اور "زعمِ قوت" کو ذہن میں تازہ کیجئے جو ان تقاریر میں پائی جاتی تھیں---- اور اس کسمپرسی اور بے چارگی کو دیکھئے کہ جو ۵۵ء میں جماعت پر طاری تھی تو حیرت ہوتی کہ محض تین سال میں جماعت اسلامی پاکستان "از کجا" "تا بہ کجا" آ چکی تھی۔

رہی دوسری بات یعنی یہ کہ آیا دستوری جدوجہد کے یہ نتائج اتنے وقیع ہیں کہ ان پر اطمینان کیا جا سکے تو اس کے سلسلے میں دو باتوں کو بھول جانا ایک عظیم غلطی ہو گی۔

ایک یہ کہ اس دستور میں اول تو کچھ ہے ہی نہیں---- اور

دوسرے یہ کہ جو کچھ ہے وہ سخت ناپائیدار ہے----

یہ دوسری بات بہت اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے---- دستور میں جیسی کچھ اسلامی دفعات بھی شامل ہوئی ہیں ان کی وقعت بھی اس صورت میں بہت زیادہ ہوتی جبکہ وہ "از خود" ایک فطری طریق پر شاملِ دستور ہوئی ہوتیں۔ اس صورت میں یہ خود اپنی قوت پر قائم رہنے کے قابل ہوتیں لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ "یہ آئی نہیں لائی گئی ہیں!" اور ان کا شاملِ دستور ہونا ایک بالکل غیر فطری طریق پر ہوا ہے۔ لہٰذا ان کا دستور میں باقی رہنا خود ان کے بس میں نہیں ہے بلکہ یہ ان حالات اور عوامل کے برقرار اور برسرپیکار رہنے پر منحصر ہے، جو ان کو وجود میں لانے کے موجب ہوئے ہیں۔

دستور کی یہ اسلامی دفعات عوام کی خواہشات کی تو شاید عکاسی کرتی ہوں لیکن

ان کی حقیقی کیفیات (نظری و عملی) کا پرتو نہیں ہیں۔ ان کی جڑیں زیادہ سے زیادہ مسلمان عوام کی خواہشات ہی میں قائم ہیں۔ ان کے دلی احساسات و جذبات' ان کے حقیقی نظریات و افکار اور ان کے واقعی اخلاق و کردار میں گہری اتری ہوئی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ دستور کو اسلامی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ایک مصنوعی اسلامی دستور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مولانا مودودی صاحب نے "مطالبۂ نظامِ اسلامی" میں فرمایا تھا---"یہاں ایک مصنوعی انقلاب برپا ہوا ہے (مراد ہے قیام پاکستان) اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رُونما ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ انقلاب کے فوراً بعد آپ سے آپ ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی!"---بعینہٖ وہی صورت حال اس دستورِ اسلامی کی ہے! یہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک مصنوعی اسلامی دستور ہے۔ اگر یہ فطری طور پر وجود میں آیا ہوتا تو آپ سے آپ قائم رہتا۔ لیکن اب ہر وقت اس بات کا خطرہ ہے کہ ایک ہی ردِّ عمل (Counter Revolution) اسے تنکے کی طرح بہا کر لے جائے۔ اِلّا یہ کہ جس طرز کی جدّ و جہد نے اسے جنم دیا ہے' وہ اسی طرز اور اسی پیمانے پر جاری رہے---اور اس کا امکان اب بے حد کم ہے!

اب اس کے پس منظر میں وہ نو سالہ جدو جہد رکھیے جو جماعت نے ان اسلامی دفعات کے حصول کے لیے کی ہے تب اس طویل جدو جہد کا "میزانیۂ نفع و نقصان" مرتب ہو گا۔ ایک تحریک کے نو سال کوئی معمولی چیز نہیں ہوتے۔ اس عرصہ میں تو تحریکیں اتنا کام کر لیتی ہیں جو آئندہ کے لیے فیصلہ کُن ثابت ہو۔ لیکن یہاں اس کے باوجود کہ جماعت اسلامی کی اکثر و بیشتر مساعی اسی ایک کام پر صرف ہوئی ہیں' اس سلسلے میں ہاتھ جو کچھ آیا ہے وہ اس قدر حقیر ہے کہ سارا کھیل سراسر زیاں کاری نظر آتا ہے۔ اول تو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ "کمیت" کے اعتبار سے بہت قلیل ہے اور پھر اس کی بھی "کیفیت" یہ ہے کہ کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اسے بہا لے جا سکتا ہے---اس خسارے اور ٹوٹے کا کہ جو جماعت کو نو سالہ جدو جہد

کے اس سودے میں اٹھانا پڑا ہے، صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اس میں کھویا کیا کچھ ہے۔ اس میں نو سال کی مساعی ہی صَرف نہیں ہوئیں جماعت کو اور بھی بہت کچھ ہاتھ سے دینا پڑا ہے (اور اس کا تذکرہ آئندہ آ رہا ہے) اور یہ سب کچھ دے دلا کر جو کچھ حاصل ہوا وہ دستور کی "چند" "نام نہاد" اور "متزلزل" دفعات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار!

اور یہ براہ راست نتیجہ ہے محض اس بات کا کہ اس اصولی اور فطری طریق کار کو چھوڑ کر کہ جو جماعت کی تاسیس کے وقت اختیار کیا گیا تھا، ۱۹۴۷ء میں ایک ایسا طریق کار اختیار کر لیا گیا جو بالکل خلافِ فطرت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے قطعاً غیر مفید تھا---!---!

(۲)

نو سالہ جدوجہد کی پہلی شق میں تو خواہ "بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی" تھوڑا بہت کچھ تو حاصل ہوا، لیکن شق دوم پر تو سوائے ہاتھ سے کچھ دینے کے حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔

انتخاباتِ پنجاب کے بعد لے دے کر ایک چیز کو کامیابی قرار دیا گیا تھا اور وہ یہ کہ ہم نے اپنے اصول کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ قطع نظر اس سے کہ تیس سیٹوں پر کامیابی کی امیدیں رکھنے کے بعد اس اصول پرستی کو بھی "کامیابی" قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں---اسے "کامیابی" مان لیا جائے تب بھی اس کامیابی کی عمر زیادہ طویل نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصے بعد بہاولپور کے انتخابات میں "اصول پسندی" کی تہمت کو بھی اتار پھینکا گیا---انتخابی Conduct Rules کی خلاف ورزیاں اس دلیل کے ساتھ کی گئیں کہ جب اور لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور حکومت انہیں نہیں روکتی تو اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ یہ Rules خود حکومت نے Defunct کر کے چھوڑے ہیں---وغیرہ وغیرہ---لہٰذا اگر "کامیابی" اس چیز کو بھی کہا جا سکتا تھا جسے

میں کہا گیا تھا تو وہ چیز بھی جماعت اپنے ہاتھ سے دے بیٹھی۔

باقی جہاں تک کامیابی کا باصطلاحِ معروف تعلق ہے اس کے لحاظ سے۔۔۔ اگر جماعت اپنی اصول پسندی کو برقرار رکھے اور انتخابی پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہ کرے۔۔۔۔ آج ہم ۵۱ء سے بھی کہیں پیچھے چلے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسی طریق کار اور اسی پالیسی کے تحت Elections میں حصہ لیا جائے تو آج جماعت اسلامی کو اتنے ووٹ بھی نہ ملیں جتنے ۵۱ء میں مل گئے تھے!

جو کچھ حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا اس کا تو عُشرِ عشیر بھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ اس سلسلے میں جو نقصان اپنی اس پالیسی کی وجہ سے ہم نے پاکستانی قوم کو بحیثیتِ قوم اور پاکستان کو بحیثیتِ ملک پہنچایا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

پاکستان کے معاملات کی باگ ڈور ابتداءً جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی تھی اگرچہ جماعت کی طرف سے تنقید کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا رہا ہے لیکن واقعتاً وہ سب بالکل ایک ہی طرح کے لوگ نہ تھے' ان میں ایک بڑی تعداد اگرچہ ایسے پیشہ ور سیاستدانوں کی تھی جو کسی بھی اصول سے ناآشنائے محض تھے لیکن ان میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی کہ جن کو ہم واقعی قوم پرست کہہ سکیں اور جو قومیت کے "مخلصین" شمار کیے جا سکیں۔ اور خوش قسمتی سے ابتداءً ایسے ہی لوگوں کو اس قیادت میں اصل قوت و مرکزیت حاصل تھی۔

اس قیادت کی صفوں میں انتشار اور تفرقہ بازی کا رونما ہونا ایک بالکل فطری اور لازمی امر تھا اور جب یہ انتشار رونما ہونا شروع ہوا تو اس قیادت کو بیک وقت دو حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ ایکؔ داخلی انتشار اور۔۔۔۔ دوسرےؔ بیرونی تنقید و مخالفت' جس کی Champion جماعت اسلامی تھی۔

جماعت اسلامی تو یہ سب کچھ اس غرض سے کر رہی تھی کہ وہ "خلا" پیدا ہو جسے "صالح قیادت" سے پُر کیا جائے لیکن عملاً نادانستہ طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بن گئی جو پاکستان کی "قومی قیادت" کو تارپیڈو کر کے اپنے لیے

میدان صاف کر رہے تھے۔ چنانچہ جب بھی قیادت میں کوئی خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کے لیے اکثر و بیشتر پہلے سے بھی بد تر لوگ آگے آئے..... اور نا سمجھی میں جماعت یہ سوچ کر مطمئن ہوتی رہی کہ اس طرح "صالح قیادت" کے لیے راہ ہموار ہو رہی ہے۔ چنانچہ قومی قیادت کے ہر ستون کے گرنے پر جماعت نے یہ محسوس کیا کہ "صالح قیادت" کے برپا ہونے کے امکانات روشن تر ہو گئے..... حالانکہ فی الواقع بد سے بد تر قسم کے لوگوں کے لیے آگے آنے کا راستہ صاف ہو رہا تھا۔

پاکستان کی قومی قیادت کا "ستونِ اعظم" تو جلد ہی اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

خان لیاقت علی خان میں لاکھ خرابیاں اور خامیاں سہی لیکن یہ اس کے بدترین دشمن بھی تسلیم کریں گے کہ وہ "قوم کا مخلص" ضرور تھا، لیکن اس پر جس بے رحمانہ انداز میں مسلسل تنقید کی گئی، اس نے "صالح قیادت" کے آگے آنے میں تو کوئی مدد نہ کی البتہ ان لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کر دیا جو اس کی مضبوط گرفت سے آزاد ہو کر ملک میں من مانی کرنا چاہتے تھے!

اور یہ تو اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ جماعت اسلامی نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو بھی ان کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران اپنی تنقید سے بچ کر جانے نہ دیا۔

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

(حالانکہ ان کی وزارت کے برطرف ہو جانے کے بعد ان کے خلوص کا اعتراف کیا گیا)..... حتیٰ کہ نادانستہ طور پر جماعت ان کے خلاف بعض علماء اور کچھ اہل سیاست کی ناپاک سازش میں استعمال ہو گئی۔

..... اس سارے طریق کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ صالح قیادت تو بروئے کار نہ آنی تھی نہ آئی، البتہ قومی قیادت کے کمزور کرنے میں جماعت کی مساعی بھی شامل ہو گئیں۔ "تعمیر" کے بارے میں جو خواب دیکھے گئے تھے وہ نہ پورے ہو سکتے تھے نہ ہوئے لیکن "تخریب" کے لیے جو مساعی کی گئی تھیں وہ ان لوگوں کے کام آگئیں کہ

جن کے پیش نظر سوائے اپنی ذاتی منفعت اور مفاد کے اور کچھ نہ تھا۔

اور آج ؎ جو یہ صورت حال پیش آگئی ہے کہ ایک ایسی قیادت ملک میں برسرکار آگئی ہے کہ جو پاکستان کے بنیادی نظریئے سے بھی اختلاف کرتی ہے اور جس کے اوپر آجانے سے خود جماعت اسلامی ان خدشات کا اظہار کر رہی ہے کہ پاکستان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا ہے تو اس صورت حال کے پیدا ہونے کی ذمہ داری سے جماعت اسلامی بھی کسی طرح بچ نہیں سکتی۔

رنگِ جدید

گزشتہ بحث میں صرف ان نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے کہ جو براہِ راست دو نکاتی پروگرام پر جدوجہد سے نکلے، ورنہ طریق کار میں اس اصولی اور بنیادی تبدیلی کے نتائج جو ۴۷ء میں کی گئی تھی ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ نتائج جماعت کے ایک ایک شعبے میں رونما ہوئے ہیں اور انہوں نے مل جل کر جماعت کی ایک بالکل ہی نئی شبیہ بنا دی ہے، جو دَورِ اول کی شبیہ سے بالکل مختلف ہے۔

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ

اب میں ذرا ان اثرات کا جائزہ لوں گا جو طریق کار کی اس تبدیلی سے جماعت کے کارکنوں---- اور جماعت کی ان خصوصیات پر مترتب ہوئے جو دورِ اول کا طرۂ امتیاز تھیں۔

اس سلسلے میں کارکنوں کے اندر دورِ اول کی چار خصوصیات کے بالکل برعکس جو خصوصیات دورِ ثانی میں پیدا ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

؎ خیال رہے کہ یہ تحریر ۱۹۵۶ء کی ہے!

نو مسلمانہ احساس کا خاتمہ

صاف نظر آتا ہے کہ وہ نو مسلمانہ احساس جو دورِ اول کے کارکنوں کی اہم خصوصیت تھی آج بالکل مفقود ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ جب نسلی اور قانونی اسلام اور اصلی اور حقیقی ایمان کے درمیان تمیز کرنا ہی چھوڑ دیا گیا اور تمام مسلمانوں کو "مسلمان" فرض کرکے مسلسل نو سال کام کیا گیا تو خود اپنے ایمان و اسلام کی عامتہ المسلمین کے ایمان و اسلام سے کسی قدر علیحدہ نوعیت کا احساس بھی ختم ہو ہی جانا چاہیے تھا! اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہوا۔ جماعت کی رکنیت اختیار کرنے کا Procedure آج بھی اگرچہ ظاہراً وہی ہے کہ جو دورِ اول میں تھا لیکن دورِ ثانی میں رکن بننے والوں کے احساسات ہرگز اس قسم کے نہیں ہوتے جن کا سراغ دورِ اول میں ملتا ہے۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ جماعت میں داخلے کے وقت لوگوں کے احساسات اب بالکل کسی سیاسی جماعت میں داخلے ہی کی طرح کے ہوتے ہیں لیکن یہ بھی بہرحال حقیقت ہے کہ وہ اس قسم کے احساسات کسی صورت میں نہیں ہوتے جو دورِ اول میں پائے جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ "جماعت کے لوگ بس اپنے آپ ہی کو مسلمان سمجھتے ہیں باقی کسی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے!" کا اعتراض جو دورِ اول میں جماعت پر اکثر کیا جاتا تھا اب کسی طرف سے سننے میں نہیں آتا۔ اس اعتراض کے پیدا ہونے کی اصل وجہ وہ احساس تھا جو اپنے اور دوسروں کی کیفیتِ ایمان و اسلام میں جماعت کا ہر فرد محسوس کرتا تھا۔ آج جب اس فرق کو جماعت کے لوگ ہی محسوس نہیں کرتے تو دوسروں کو وہ کہاں سے محسوس ہو!

سیرت و کردار کا انحطاط

پھر یہ معاملہ "احساس" ہی کا نہیں "صورتِ واقعہ" کا بھی ہے۔ ارکانِ جماعت کی زندگیاں عملاً اب وہ معیار پیش نہیں کرتیں جو دورِ اول کے ارکان کی زندگیاں پیش

کرتی تھیں۔

● "سیرت و اخلاق و کردار" کا سرمایہ جو کسی انقلابی جماعت اور خصوصاً اسلامی جماعت کی اصل قوتِ تسخیر ہوتا ہے اب رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم ہونے پر آرہا ہے۔ وہ نمایاں فرق جو جماعت کے اندر اور اس کے باہر کے لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتا تھا اب مدہم پڑتے پڑتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اگرچہ اب بھی یہ فرق موجود ہے لیکن اس کی مقدار اتنی کم ہو چکی ہے کہ دورِ اول کے مقابلے میں اسے "عدم" ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جماعت کے عام ارکان ہی نہیں اس کے بڑے بڑے لوگوں کے "معاملات" بھی عوام میں زیرِ بحث آکر پوری جماعت کو بدنام کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ لین دین کرتے ہوئے اب وہ اعتماد جماعت کے اراکین آپس میں ایک دوسرے پر بھی نہیں کر سکتے کہ جو دورِ اول میں جماعت کے باہر کے لوگ بلا تکلف جماعت کے لوگوں پر کر لیا کرتے تھے.... غرض وہ زبردست "اخلاقی وقار" جو جماعت نے اپنے دورِ اول میں پورے ماحول پر قائم کر دیا تھا اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

● اب "تصادم" اور "کشمکش" کی وہ کیفیت بھی کہیں نظر نہیں آتی جو دورِ اول میں جماعت کے ہر فرد اور اس کے آس پاس کے ماحول میں نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس ماحول کے ساتھ "تعاضد" و "تناصر" کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ کہاں وہ کیفیت تھی کہ ایک شخص جماعت کا رکن بنا نہیں کہ اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور اس کے اپنے گھر اور خاندان سے لے کر پورے معاشرے کے ساتھ چو مکھی جنگ کا محاذ قائم ہو گیا! کہاں اب یہ حالت ہے کہ لوگ جماعت کے رکن بن جاتے ہیں لیکن پھر بھی کہیں کوئی کشمکش یا تصادم نظر نہیں آتا.... اس کی وجہ یہ تو بہرحال نہیں ہے کہ اب ماحول پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ ماحول تو پہلے سے بھی پست ہی ہوا ہے۔ اس میں "دین" کا عنصر اور اس کا تناسب پہلے کی نسبت کم اور بے دینی کا تناسب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے اخلاق و کردار کا معیار پہلے کے مقابلے میں کہیں نیچے جا چکا ہے.... بلکہ یہی اور صرف یہی ہے کہ اب خود جماعت کے ارکان کا دینی و اخلاقی

معیار اپنی پہلی سطح سے گر کر عوام الناس کی سطح تک آچکا ہے۔

جوشِ کار اور جذبۂ ایثار میں کمی

پھر "جوشِ کار"۔۔۔۔اور "جذبۂ ایثار" کا جو عالم اب جماعت کے ارکان میں پایا جاتا ہے' اس نے تو پوری جماعت میں تشویش کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ وہ تمام اچھے اچھے کارکن کہ جو کسی زمانے میں ایثار کے مجسمے اور ہمت و عزیمت کے پتلے ہونے میں اپنی مثال آپ تھے ایک ایک کر کے سرد مہری کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جماعت میں "رخصت" کی ایک عام وبا پھیل گئی ہے۔ "معذرت" اور پھر نری معذرت بھی نہیں' "عذر شرعی" کا معیار اب اس درجہ پست ہو گیا ہے کہ بالکل معمولی معمولی کاموں اور ذرا ذرا سی مصروفیتوں کے باعث جماعت کے اہم ترین کاموں سے استثناء کی درخواست دائر کر دی جاتی ہے' بلکہ درخواست تو دور کی بات ہے اکثر و بیشتر بعد میں معذرت موصول ہوتی ہے۔

اور یہ کیفیت صرف ان لوگوں میں نہیں ہے کہ جو بعد از تقسیم رکن بنے ہیں' بلکہ ان میں بدرجۂ اولیٰ و اتم ہے جو تقسیم سے قبل رکن بنے تھے اور جماعت میں "سابقون الاولون" کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعد کے رکن تو پھر بھی۔۔۔۔ خواہ بدلے ہوئے تصورات اور کچھ نئے محرکاتِ عمل کے تحت ہی سہی۔۔۔۔ کسی قدر فعال نظر آتے ہیں۔ لیکن ان "سابقون الاولون" کی کیفیت تو اکثر و بیشتر اس طرح کی ہے کہ سر پر سوار ہو کر کوئی کام نکلوا لو تو شاید ہو جائے از خود ان کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ جائزہ کمیٹی سے ملاقات میں میں نے منٹگمری کے آس پاس کے چند لوگوں کی مثال نام لے کر پیش کی تھی۔ یہاں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں' اس حلقہ میں جماعت اسلامی کے جو پرانے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے:

ایک ۔۔۔۔۔۔ صاحب ہیں' ان کے بارے میں عام اراکین اب برملا یہ کہتے ہیں کہ ان میں نہ وہ پرانا جوش کار ہے اور نہ جذبۂ ایثار' حتیٰ کہ مالی اعانت کا معاملہ بھی اب

کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے!

دوسرے ۔۔۔۔ صاحب ہیں جن کے ایثار اور جذبۂ کار کو جماعت میں اس سے پہلے ایک قابلِ تقلید مثال کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا ۔۔۔۔ آج ان کی کیفیت یہ ہے کہ وقت کا تو سوال ہی نہیں' ایک مالی اعانت ہے جو وہ کر دیتے ہیں لیکن اس کی کیفیت بھی یہ ہے کہ قیمِ حلقہ خود ان کے گاؤں جا کر سر پر سوار ہو کر کچھ نکلوا لائیں تو "حقِ محنت" وصول ہو جاتا ہے' از خود مالی اعانت بھی نہیں کرتے اور حال یہاں تک آ پہنچا ہے کہ نصف درجن خطوط دفتر حلقہ سے ارسال کیے جائیں تو ایک کا جواب موصول ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

تیسرے جناب ۔۔۔۔۔ صاحب ہیں۔ ان کی کیفیت ان دونوں حضرات سے بھی گئی گزری ہے۔

چوتھے جناب شیخ ۔۔۔۔۔ صاحب ہیں جن کا معاملہ سب سے دگرگوں ہے۔ وہ جماعت ۔۔۔۔ کے رکن تھے لیکن وہاں کے دوسرے ارکان نے ان کی سرد مہری سے تنگ آ کر بالآخر اس بات سے فائدہ اٹھایا کہ ان کا قیام شہر سے "ایک میل" دور ہے اور تجویز کیا کہ ان کو ایک منفرد رکن بنا دیا جائے' تاکہ مقامی جماعت کا پیچھا ان سے چھوٹ جائے۔ پورے شہر ۔۔۔۔ میں' خصوصاً ان حلقوں میں کہ جن کا ان سے کاروباری تعلق ہے' وہ انتہائی بدنام ہیں اور کہیں سے کوئی کلمہ خیر ان کے حق میں سننے میں نہیں آتا۔

پانچویں حافظ ۔۔۔۔۔۔ صاحب ہیں جو کہ ایک طویل عرصے تک بالکل تعطل کی سی کیفیت میں رہے ہیں۔ اب پھر ذرا فعال ہوئے ہیں لیکن وہ پہلی سی کیفیت ان میں اب بھی نظر نہیں آتی۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جن میں کا ایک ایک پہلے سینکڑوں پر بھاری تھا ۔۔۔۔ نئی بھرتی کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے صرف وہی لوگ کام کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ جنہیں کام کا کوئی معاوضہ بھی دیا جاتا ہو۔ ان "تنخواہ یافتہ" لوگوں کے علاوہ کوئی کام کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتا ہے۔ اور یہ بامعاوضہ کام کی لے اس درجہ بڑھ گئی

ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی کاموں کے لیے بھی بلا معاوضہ خدمات دستیاب نہیں ہوتیں' بامعاوضہ ہی کام کرانا پڑتا ہے۔

قبل از تقسیم کی یہ کیفیت کہ بس "اقامتِ دین" ہی کی دُھن اور اسی کی لگن اس تحریک کے کارکنوں کو ہوتی تھی' اسی کے لیے ان کا جینا تھا اور اسی کے لیے مرنا..... اور اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی "زیاں کاری" کو قبول کر لیتے تھے' اب کہیں نظر نہیں آتی۔ (الا ماشاء اللہ)--- دنیا کے کاروبار میں انہماک روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنے کاروبار کی فکر اب زیادہ ستاتی ہے اور اس سے جو وقت بچ جائے زیادہ سے زیادہ اس کو پیش کیا جاتا ہے' اور نہ صرف یہ کہ اپنی طرز رہائش و بود و باش کا معیار بلند کر لیا گیا ہے اور اس کو برقرار رکھنے ہی پر اکثر و بیشتر مساعی اور صلاحیتیں صرف ہو جاتی ہیں بلکہ اب تو دنیا میں پھلنے پھولنے کی امنگیں زور کر رہی ہیں۔ مستقبل بنانے کی دھن ذہنوں پر سوار ہے۔ کاروبار کی ترقی اصل مرکزِ نگاہ ہے.... اور جماعت کا کام بس ثانوی ہو کر رہ گیا ہے.... جو ہو جائے تو اچھا ہے--- نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔

مِن حیث المجموع اس وقت جماعت اپنے تنخواہ یافتہ کارکنوں کے سر پر کھڑی ہے۔ ذرا انہیں ایک مرتبہ ہٹا دیجیے' آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کا پورا ڈھانچہ کس طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ عام کارکنوں کے بل پر آپ ایک قدم حرکت نہیں کر سکتے۔ ہمہ وقتی کارکن اس وقت جماعت کی روحِ رواں ہیں---- کہاں تو وہ حالت تھی کہ تمام ارکان ہمہ وقتی کارکن تھے' کہاں آج معدودے چند رہ گئے ہیں---- اور وہ بھی کام "اقامتِ دین کی فرضیت" کے احساس سے زیادہ "ملازمانہ" احساسات کے تحت کرتے ہیں۔

مجھے اس پر حیرت نہیں ہے کہ یہ کیفیات کیوں پیدا ہو گئیں۔ ان کا پیدا ہونا فطری اور لازمی تھا۔ جو طریق کار ۴۷ء میں اختیار کیا گیا تھا اس نے جماعت کو پہلے تو ایک "انقلابی جماعت" کے مقام سے گرا کر ایک "قومی جماعت" بنایا اور پھر "قومی" سے بھی گرا کر ایک "سیاسی" جماعت بنا کر رکھ دیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے

کارکنوں کے نقطہ ہائے نظر اور ان کی کیفیات کا بدلنا لازمی تھا۔ یہ کیفیت رونما ہوئی ہے تو اس میں حیرت و استعجاب اور چیخ و پکار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ حیرت ہوتی ہے تو اس امر پر کہ جماعت اسلامی کی قیادت کے سامنے جب یہ اثرات اور نتائج پیش کیے جاتے ہیں تو بڑے ہی تعجب اور حیرت کے ساتھ فرمایا جاتا ہے: "اچھا! اب جماعت میں یہ بھی ہونے لگا ہے!" گویا کہ اس کا ہونا غیر متوقع اور ناگہانی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ صرف ایک "اسلوبِ بیان" ہے یا واقعتاً جماعت اسلامی کے قائد اس موٹی سی بات سے بے خبر ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہمارے موجودہ طریق کار کے فطری اور لازمی نتائج ہیں ---- اور حیرت پر مزید حیرت ہوتی ہے اس بات سے کہ ان باتوں پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ضرورت جو محسوس کی جاتی ہے وہ اس بات کی ہے کہ ایک سرکلر شائع کر دیا جائے اور اس کے بعد ہماری قیادت اطمینان کے ساتھ اسی رستے پر پھر چل کھڑی ہوتی ہے جس پر چلنے ہی سے یہ چیزیں پیدا ہوئی ہیں اور جس پر مزید چل کر ان میں اضافہ تو بہرحال کیا جا سکتا ہے، کمی کی کوئی صورت پیدا نہیں کی جا سکتی۔[۵۰]

---

[۵۰] دوسری اسیری کے بعد ملتان جیل سے رہا ہونے پر جب مولانا مودودی صاحب نے دوبارہ امارت جماعت کا چارج سنبھالا تو ان کے علم میں کچھ باتیں لائی گئیں جو خصوصاً بیت المال کے معاملے میں جماعت کے لوگوں کی بے احتیاطیوں اور بے ضابطگیوں پر مشتمل تھیں۔ اس پر جو ردعمل مولانا کی جانب سے ظاہر ہوا وہ ایک سرکلر کی شکل میں تھا، جو غالباً تمام ارکین جماعت کو دیا گیا تھا۔ اس کے مطالعے سے ہلکی سی امید پیدا ہوئی تھی کہ مولانا نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کر لیا ہے اور اب ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی تبدیلی اور طرز عمل میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور واقع ہو گا ---- لیکن بس اس ایک سرکلر کے بعد پھر کوئی آثار اضطراب یا پریشانی کے ظاہر نہ ہوئے ---- اور اپنے طریق کار کی تبدیلی کا تو غالباً سوال ہی مولانا کے ذہن میں پیدا نہ ہوا ----!

محبت اور اخوت کا فقدان

جماعت کے متعلقین کے آپس کے تعلقات بھی اب مایوس کن حد تک کمزور ہی نہیں بلکہ بعض جگہ پر تو افسوسناک حد تک خراب ہیں۔

وہ تعاضد و تناصر' وہ ہمدردی اور باہمی امداد و تعاون اور وہ خلوص اور محبت جو جماعت کے دَورِ اول میں اس کے کارکنوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اب کہیں نظر نہیں آتی۔ اور کہیں نظر آجائے تو آج کے حالات میں "عجیب" معلوم ہوتی ہے۔ اب ان چیزوں کے فقدان کو جماعت کا ہر حساس شخص محسوس کر رہا ہے۔ ان چیزوں کی جگہ اب صرف سطحی سے میل جول' خشک اور اوپرے تعلقات اور ایک قانونی اور دلی جذبات سے عاری تعلق نے لے لی۔ دورِ اول کے

ع من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

سے معاملات اب

ع تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

کی نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔

اب دو ارکان کی آپس کے ملاقات کے موقع پر چہرے خوشی اور مسرت سے تمتما نہیں اٹھتے۔ ایک کے دکھ کو دیکھ کر دوسرے کے دل میں بے چینی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک کی مصیبت میں کسی دوسرے کے دل میں شریک ہونے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی--- اب ملاقات کے موقع پر سرد مہری چہرے سے ٹپکی پڑتی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے لاتعلقی طرز عمل میں نمایاں نظر آتی ہے۔--- اور تعلقات اگر ہیں تو بس اتنے جتنے کسی سیاسی جماعت کے کارکنوں میں ہوا کرتے ہیں۔

اسی پر اکتفا نہیں ہے---- اب جماعت کے اراکین کی آپس کی مقدمہ بازیاں ہی جماعت کے لیے ایک دردِ سر بن گئی ہیں۔ ارکان جماعت کے جھگڑوں اور قضیوں کا نمٹانا ہی (بقول مولانا امین احسن اصلاحی) امراءِ جماعت کی سب سے بڑی مصروفیت

ہے۔ باقاعدہ دھڑے بندیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ آنکھوں سے جو جذبات ٹپکتے ہیں ان میں بلا سے "محبت" نہ ہوتی تو بھی معاملہ اس قدر سنگین نہ ہوتا' یہاں تو باقاعدہ "نفرت" پائی جاتی ہے۔

"رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کی وہ شان جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے اور فی الواقع قبل از تقسیم---- اور تقسیم کے بعد بھی ایک عرصے تک جماعت میں پائی جاتی تھی' آج اس کا فقدان بالکل ظاہر ہے---اور یہ بات جماعت میں ہر سوچنے سمجھنے والے کو تشویش میں ڈالے ہوئے ہے۔

جماعت کے کارکنوں کی حالیہ کیفیت کا جو نقشہ اوپر کے صفحات میں کھینچا گیا ہے اس کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب ۴۷ء میں طریق کار تبدیل کیا گیا' لیکن اس کے نقوش کو اجاگر ہونے میں دیر لگی۔ تاہم ۵۳ء'۵۴ء میں یہ نقوش بھی اجاگر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور اب تو یہ اس قدر نمایاں ہیں کہ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ دے کر ہی ممکن ہے کہ اس بھیانک تصویر کو دیکھنے سے بچا جا سکے!

جب ان نتائج کے آثار ہویدا ہونے شروع ہوئے تو اس بات کی ضرورت تھی کہ صورت حال کی اصل نزاکت اور معاملے کی اصل نوعیت کا ادراک کیا جاتا۔ مرض کی اصل تشخیص کی جاتی اور پھر مناسب اور شافی علاج کیا جاتا---- لیکن جو کچھ عملاً ہوا وہ یہ کہ ایک طرف تو ان باتوں پر اظہارِ اطمینان کیا گیا کہ---- "ابھی ہم اتنے نہیں گرے---!---- اور ابھی ہم دوسری سیاسی جماعتوں سے اخلاق' کردار' جوشِ عمل' ڈسپلن اور خلوص میں بہت آگے ہیں[*]" اور دوسری طرف اصلاحِ حال کی کوئی سعی کی

---

[*] یاد رہے کہ سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی (۵۵ء) میں اس مفہوم پر مشتمل چند فقرے مولانا مودودی صاحب کی زبان سے نکلے تھے جنہیں مولانا نے کسی صاحب کے توجہ دلانے پر واپس لے لیا تھا۔

بھی گئی تو وہ کچھ اس وجہ سے کہ مرض کی صحیح اور گہری تشخیص کی بجائے ایک سطحی سے احساس پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ وقت کی مصروفیات نے مہلت نہ دی' کچھ ایسی زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی۔ بحث طویل ہو رہی ہے لیکن جو کچھ کوشش بھی کی گئی اس کے غیر موثر ہونے کی وجہ بھی میں چاہتا ہوں کہ بیان کردوں---"تربیت گاہوں" کا جو سلسلہ اس ضرورت کے احساس کے تحت شروع کیا گیا تھا اس کے غیر موثر ہونے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ یہ محدود پیمانے پر تھا' لیکن دوسری اور بڑی وجہ دراصل یہ تھی کہ تربیت گاہوں میں جس لٹریچر کے پڑھانے پر پورا وقت اور سارا زور صرف کیا جاتا تھا وہ اکثر و بیشتر قبل از تقسیم کا لکھا ہوا تھا' جس کے مطالعے سے ایک انقلابی جماعت کا نقشہ نظروں کے سامنے آتا تھا اور اسے ذہنوں میں پختہ کر کے جماعت کے کارکن عملی میدان میں آتے تھے تو وہاں ساری جدوجہد "ایک قومی سیاسی جماعت" کے طرز پر ہو رہی ہوتی تھی۔ اس سے جہاں اور بھی کئی دلچسپ ردعمل ظاہر ہوئے (مثلاً---یہ عام خواہش کہ اب ہمارا لٹریچر پرانا ہو گیا ہے---نئے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے!) وہاں یہ بہرحال ہوا کہ تربیت گاہوں کے تمام اثرات عمل کے میدان میں آتے ہی ختم ہو جاتے رہے اور اس طرح تربیت گاہیں اصلاح حال میں قطعاً کامیاب ثابت نہ ہوئیں۔

نقوش تازہ

دورِ اول کی جماعت کی بحیثیت جماعت جو چار خصوصیات میں نے بیان کی تھیں' ان کے بالکل برعکس جو چار صفات دورِ ثانی کی جماعت میں بحیثیتِ جماعت پائی جاتی ہیں' وہ یہ ہیں:

عوام پرستی

اس دور میں "حق پرستی" کی بجائے "مصلحت پرستی" اور "عوام پرستی" جماعت اسلامی کے طرز عمل کی نمایاں خصوصیت ہے۔

"نسلی مسلمانوں کے لیے دو راستے" نامی مضمون میں مولانا مودودی صاحب نے حق پرستی اور اصول پرستی کو تحریک اسلامی کی لازمی صفت اور مصلحت پرستی' موقعہ شناسی اور عوامی خواہشات کی پیروی کو قومی تحریک کی لازمی خصوصیت کی حیثیت سے بیان کیا تھا---- یہ اصول اس قدر صحیح اور اٹل ثابت ہوا کہ خود جماعت اسلامی بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچی!

جب تک یہ ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی اس میں حق پرستی اور حق گوئی کی شان بالکل نمایاں رہی۔ اور "حق گوئی" اور اس میں "بے باکی" کی عظیم الشان مثالیں اس نے پیش کیں اور اس سلسلے میں اس نے کبھی "روباہی" کا ثبوت نہ دیا۔

لیکن جب اس نے ایک 'قومی جماعت کا روپ دھار لیا تو وہ اصول پرستی اپنی موت آپ مر گئی۔ تا آنکہ اب بے اصولے پن کی عملی مثالیں ہی نہیں (ان کی تو پھر بھی توجیہ کی جا سکتی ہے) قولاً بھی اس کا اعتراف (اگرچہ ذرا خوشنما الفاظ میں) جماعت کے انتہائی ذمہ دار لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک قومی جماعت کے لیے ملکی اور قومی مسائل میں قومی میلانات و رجحانات--- اور قوم کے احساسات و جذبات کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ یہی جماعت اسلامی کو بھی کرنا پڑا۔

اس داستان کا المناک ترین باب "مسئلہ قادیانیت" میں جماعت اسلامی کا طرز عمل ہے! اس کے دوران جماعت اور اس کے قائدین نے جس طرح اپنے اصولوں کی بجائے عوام کے چشم و ابرو کے اشاروں پر حرکت کی ہے' اسے دیکھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ---- اتنی قلیل مدت میں ایک جماعت کا مزاج اس درجہ بھی بدل سکتا ہے؟

اس مسئلے کے بارے میں چند باتیں بالکل واضح ہیں:

● ایک یہ کہ یہ مسئلہ کوئی آج کی پیداوار نہیں تھا بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر ہی سے اس کے بارے میں مسلمانوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے

تھے.... لیکن اپنے تاسیس کے دن سے لے کر ۵۲ء تک پورے گیارہ بارہ سال جماعت اسلامی نے بحیثیتِ جماعت یا اس کے اکابرین نے بحیثیتِ افراد اس پر کوئی عملی اقدام کرنا تو کجا زبان سے ایک حرف تک نہ نکالا' بلکہ ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے اپنے دورِ اول میں اس نے ایسی باتیں کہیں کہ جن سے قادیانیوں کی تکفیر کی براہ راست نہ سہی بالواسطہ ضرور ہمت شکنی ہوتی ہے! (ملاحظہ ہو تکفیر بغیر اتمامِ حجت سے متعلق جماعت کا نقطۂ نظر' ص ۵۷)

● پاکستان کے قیام کے بعد کچھ عرصہ خفّت اور ندامت کے باعث خاموش رہ کر جب زعماءِ احرار نے اپنے لیے یہ راہِ عمل تجویز کی کہ ایک طرف سیاسی طور پر مسلم لیگ میں مدغم ہو جایا جائے اور دوسری طرف اپنے تشخص کو اینٹی قادیانی تحریک اٹھا کر باقی رکھا جائے اور اس پروگرام پر انہوں نے عمل در آمد شروع کر دیا تو جب تک ان کی مساعی ابتدائی دور میں رہیں جماعت اسلامی کے اکابرین نے نجی محفلوں میں قادیانیوں اور ان کے خلاف احرار کی تحریک کے بارے میں کیے گئے سوالات کے مندرجہ ذیل جوابات دیئے:

۱۔ ختمِ نبوت لازماً جزوِ ایمان ہے اور اس کا منکر کافر.... لیکن تکفیر کا کام کسی فرد یا کسی گروہ کے کرنے کا نہیں بلکہ اسلامی ریاست کا کام ہے۔

۲۔ "قادیانیت" مسلمان قوم میں دین حق سے لگاؤ میں انحطاط آجانے کی وجہ سے پیدا ہونے والی اور دوسری بہت سی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ دین کی اصل تعلیمات واضح نہیں ہیں۔ اور اس کا علاج منفی طور پر اس کی مخالفت اور بیخ کنی سے نہ ہوگا بلکہ اس طرح ہوگا کہ دین کی اصل تعلیمات کو واضح اور عام کیا جائے۔

۳۔ قادیانیوں کی مخالفت جس طرز پر ہو رہی ہے' وہ ان کو کوئی نقصان پہنچانے کے بجائے ان کی تقویت کا موجب ہو رہی ہے۔ اگر ان کا ابطال کرنا ہی ہے تو چاہیے کہ سنجیدہ علمی اور Scientific طریقے پر ان پر تنقید کی جائے اور عوام کو ان کے خلاف

اور گمراہ کن عقائد سے خبردار کیا جائے۔

۴۔ قادیانیوں کا معاملہ صاف ہو تو بھی لاہوری احمدیوں کا معاملہ اس قدر صاف نہیں ہے۔ چونکہ وہ مرزا غلام احمد کو صرف ایک مجدد مانتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تکفیر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔"

مطلب یہ کہ "قادیانیت" بذاتِ خود نہ تو سرے سے اس قابل ہے کہ اسے ایک مسئلہ بنایا جائے' اور بنایا جائے تو اس فتنے کے ابطال کا وہ طریق کار جو مجلس احرار نے اختیار کیا ہے' نہ اصولاً صحیح ہے اور نہ نتائج کے اعتبار سے مفید!

● لیکن جب ۵۲ء میں زعمائے احرار نے اسے واقعی ایک مسئلہ بنالیا اور عوام کے جذبات کو مشتعل کر لیا تو اب جبکہ اصول پرستی اور مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ یہی باتیں علی الاعلان کہی جاتیں اور لوگوں کو بتایا جاتا کہ تم خواہ مخواہ مشتعل کیے جارہے ہو' نہ یہ مسئلہ اتنی اہمیت رکھتا ہے اور نہ اس کے حل کی صورت وہ ہے کہ جو اختیار کی جارہی ہے..... اور اگر عوام اسے رد کرتے تو کم از کم "اِنِّی بَرِیٌٔ مِّنکُم" کہہ کر الگ ہو جایا جاتا..... جماعت اسلامی نے اپنی اصول پسندی اور اصول پرستی کو ذبح کر کے..... "حق گوئی" سے جی کتراتے اور "روباہی" کا ثبوت دیتے ہوئے جو طرز عمل اختیار کیا وہ "بے اصولے پن" ..... اور "عوام خوفی" کی عملی تصویر ہے۔ چنانچہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ ہشت نکاتی مطالبے میں نویں نکتے کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ اور مجلس عمل کے ساتھ تعاون شروع کر دیا گیا اور ان لوگوں کی قیادت قبول کر لی گئی کہ جن کے پاس بیٹھتے ہوئے بھی بقول "یکے از بزرگانِ جماعت" جماعت کے زعماء کو "گھن آتی تھی۔" اور جن کے حقیقی ارادوں اور عزائم پر سے بعد میں مولانا مودودی نے "بیانِ حقیقت" میں پردے اٹھائے! (یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مولانا مودودی صاحب احرار کے عزائم سے کراچی کے مجلس عمل کے اجلاس سے پہلے بالکل بے خبر تھے۔ اور ان کے نیتوں کے بارے میں پہلے وہ خوش فہمی میں مبتلا تھے..... ذہن قبول نہیں کرتا کہ ایسا ہو سکتا ہے..... تو پھر ان "بدنیت" لوگوں کے

ساتھ تعاون کس اصولِ "اخلاق و دیانت" کی رُو سے صحیح تھا؟)

● صرف یہی نہیں کہ عوام کے "تقویٰ" کی وجہ سے جماعت نے اس معاملہ میں حصہ لینا شروع کر دیا بلکہ ان کی بارگاہ میں "احسان" کا درجہ حاصل کرنے کی سعی شروع ہو گئی اور "قادیانی مسئلہ" تصنیف ہوا، جس میں "عوام" کے مطالبات کی وجوہات اور ان کے دلائل کو مولانا مودودی صاحب نے پُر زور انداز میں پیش کیا۔ اس کتاب کے آخری پیرے میں یہ "عوام پرستی" جس طرح جھلکی پڑتی ہے وہ قابلِ دید ہے:

"اس میں شک نہیں کہ اس مطالبے کو منوانے کے لیے عوام جس طریقے سے مظاہرے کر رہے ہیں وہ شائستہ نہیں ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ کسی طرح اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی قوم کے عوام کو یہ تربیت دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ابھی چند ہی سال پہلے اسی پنجاب میں ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے مسلم لیگ نے جو ایجی ٹیشن کیا تھا وہ اس تازہ ایجی ٹیشن سے اپنی کون سی خصوصیات میں کچھ گھٹ کر تھا؟ یہ تو موجودہ قائدینِ ملت کا اپنا لگایا ہوا باغ ہے جس کی بہار دیکھ کر وہ آج گھبرا اٹھے ہیں۔ اب اس مظاہرۂ ناشائستگی کا الزام "مُلّا" کو دیا جا رہا ہے مگر ہمیں بتایا جائے کہ خضر حیات خاں کے خلاف جس شائستگی کے مظاہرے ہوئے تھے وہ کس "مُلّا" نے کرائے تھے؟ انہی مُلّا حضرات کا تو اب یہ منہ نہیں ہے کہ شائستگی و ناشائستگی کا سوال چھیڑیں۔ انہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ مطالبہ معقول ہے یا نہیں اور اس کی پشت پر رائے عامہ کی طاقت ہے یا نہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں ثابت ہیں تو پھر جمہوری نظام میں کسی منطق سے ان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔"

---- جذبۂ عوام پرستی کی انتہا ہے کہ ان خامیوں اور خرابیوں کو بھی خوشنما الفاظ کے پردے میں چھپا کر پیٹھ ٹھونکی جا رہی ہے کہ تم سے کچھ غلطیاں تو ضرور سرزد ہو رہی ہیں لیکن گھبراؤ نہیں!---- اس میں تمہارا قصور تھوڑا ہی ہے!

● اس کے بعد جب "احرار" کے ساتھ مزید چلنا ناممکن ہو گیا اور مجلس عمل سے علیحدگی ناگزیر ہو گئی تو بھی اس احتیاط کے ساتھ علیحدگی کا اعلان کیا گیا کہ عوام اسی بھرتے میں رہیں کہ "... ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے!" آخر عوام کی ناراضی مول لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

● پھر جب معاملہ تحقیقاتی عدالت میں آیا تو اس وقت مولانا مودودی صاحب نے حالات کو بگاڑنے کی ذمہ داری میں حکومت اور قادیانیوں کے ساتھ ساتھ "احرار" کو بھی شریک کیا! یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تینوں برابر کے ذمہ دار تھے تو آج سے قبل آپ ساری ذمہ داری حکومت اور قادیانیوں پر کیوں ڈالتے رہے؟ کچھ تو آپ نے احرار کے بارے میں بھی فرمایا ہوتا!---اور جماعت اسلامی کو من حیث الجماعت تو اس "قولِ ثقیل" کے کہہ گزرنے کی پھر بھی ہمت نہ ہوئی۔ جماعت نے اپنے بیان میں ساری ذمہ داری صرف حکومت اور قادیانیوں ہی پر ڈالی۔

● تحقیقاتی عدالت میں مولانا اور جماعت نے اپنے آپ کو ان سارے معاملات میں بالکل بریٔ الذمہ ٹھہرانے کی کوشش کی اور اس کے لیے سارا زور اس استدلال پر صرف کیا کہ ہم نے مجلس عمل سے علیحدگی اختیار کر لی تھی.... لیکن میں اس معاملے میں تحقیقاتی عدالت کے اس فیصلے کو بالکل صحیح سمجھتا ہوں کہ

> "ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ آیا جماعت نے علیحدگی اختیار کر لی تھی یا نہیں۔ دونوں طرف حلفیہ بیان ہیں [۵۵] اور ہمیں ان میں سے کسی کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا کہتے دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ عوام کے سامنے جماعت کی پوزیشن کیا تھی اور یہ بالکل صاف ہے کہ عوام کے سامنے جماعت نے اپنے آپ کو ان کے Cause میں شریک ہی کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ لہٰذا جماعت اسلامی ذمہ داری میں احرار کے ساتھ برابر کی شریک

---

[۵۵] ایک طرف جماعت کا حلفیہ بیان تھا کہ ہم نے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور دوسری طرف مجلس احرار کی جانب سے اس کی حلفیہ تردید تھی۔

ہے۔"

(تقریباً اسی قسم کے الفاظ تھے۔ میرے پاس رپورٹ اس وقت موجود نہیں ہے)

● اس کے بعد جب تک مقدمات چلتے رہے اور عوام کے جذبات میں اس مسئلہ پر حرارت باقی رہی' جماعت کے رسائل و اخبارات اس مسئلہ پر مسلسل لکھتے رہے۔ جب فضا ٹھنڈی ہو گئی' جماعت نے بھی مسئلہ کا نام لینا بند کر دیا اور آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں تھا۔

یہ پوری داستان بے اصولے پن اور عوام پرستی کا شاہکار نہیں تو اور کیا ہے؟

تقدیم و تاخیر میں انقلاب

اس دور میں طریق کار میں تقدیم و تاخیر اور مختلف کاموں میں تدریج و ترتیب بھی عملاً بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

● پہلے علمی اور تعلیمی کام سب پر مقدم تھا۔

اب وہ سب سے مؤخر ہو گیا ہے۔۔۔۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں بالکل ختم ہو کر رہ گیا! خالص علمی کام کے سلسلے میں اس دور میں صفِ اول کے اہل قلم کو تو کچھ کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں مل سکا' صفِ دوم کے اہل قلم نے کچھ کام کیا ہے لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اور اولاً تو اس کا معیار بھی کچھ ایسا بلند نہیں اور ثانیاً ہو تا بھی تو ان کا علمی دنیا میں مرتبہ و مقام ہی ابھی ایسا نہیں ہے کہ ان کا کوئی کام فوراً نگاہوں کے سامنے آسکے۔

اس کی وجہ بہرحال یہ تو نہیں ہے کہ علمی کام کافی مقدار میں ہو چکا ہے اور مزید کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جو کام ہوا ہے اس کی حیثیت جتنا کام مطلوب ہے اس کے مقابلے میں پرِ کاہ کی بھی نہیں ہے اور اس کے بغیر کسی پائیدار اور مستحکم انقلاب کے خواب دیکھنا ایک بدیہی غلطی ہے۔ تو ضرورت تو بہرحال تھی اور ہے' لیکن ہو یہ اس لیے نہ سکا کہ "دوسری مصروفیات" نے وقت نہ دیا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جماعت اسلامی کے سب سے زیادہ مؤثر اور

کار گر ہتھیار دو تھے۔ ایک اس کا اخلاقی دبدبہ اور وقار اور دوسرے اس کا وہ علمی مرتبہ اور رعب جس کا لوہا اس نے ایک قلیل مدت میں منوا لیا تھا۔ ان میں سے پہلے کے کند ہونے کا تذکرہ تو میں کر چکا ہوں۔ یہاں گزارش یہ ہے کہ یہ دوسرا ہتھیار بھی کند ہو چکا ہے۔

اس کے کند ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ ہوا کہ علمی کام جماعت کے حلقے میں بند ہو چکا ہے اور جماعت کا علمی سرمایہ صرف وہ چند کتابیں ہیں جو بالکل اوائل میں لکھی گئی تھیں اور جو اپنی جگہ پر اگرچہ بہت وقیع ہیں اور جس زمانے میں وہ منصۂ شہود پر آئیں تو میدان میں چونکہ یہ اپنی قسم کی واحد کوششیں تھیں لہٰذا انہوں نے ایک مرتبہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں اپنا وزن محسوس کرا لیا تھا لیکن بہرحال ان کی حیثیت پیش نظر علمی انقلاب کے صرف دیباچے کی تھی۔ اصل کام تو ان سے شروع ہونا تھا لہٰذا جب انہی پر Full Stop لگ گیا تو ان کی وقعت کو بہرحال گرنا تھا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان نو سالوں میں کہ جن کے دوران میں جماعت کے حلقے میں علمی بازار بالکل سرد رہا ہے کچھ اور حلقوں نے آگے بڑھ کر اور جماعت سے بہتر نہیں تو بہرحال اس ہی کی طرح کا کچھ نہ کچھ علمی سرمایہ فراہم کر لیا ہے۔ ایک طرف "تجدّد" کے علمبرداروں نے اس مہلت سے پورا فائدہ اٹھایا اور پے در پے اس قدر تصانیف میدان میں لا کر ڈال دیں کہ اور کچھ نہیں تو بہرحال یہ تو ہو گیا کہ اب جماعت اسلامی میدان میں تنہا نہیں ہے بلکہ مقابل کی قوتیں آ موجود ہوئی ہیں۔ ادارۂ طلوعِ اسلام اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور اسی طرح کے کچھ اور اداروں نے کتابوں کے انبار کے انبار لگا دیے ہیں اور جماعت اسلامی کا وہ علمی دبدبہ اور وقار جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اب باقی نہیں رہا ہے جو اس سے قبل تھا۔ دوسری طرف "قدامت پرست" حلقے بھی خاموش نہیں بیٹھے رہے۔ انہوں نے بھی جس طرح کی تصانیف بھی ان سے بن پڑیں مرتب کیں اور میدان میں لے آئے تاکہ "علم کی پیاس" کی وجہ سے ان کے

اپنے حلقوں کے جو لوگ جماعت اسلامی کی طرف متوجہ ہو رہے تھے ان کو اپنے ہی حلقوں کی کتب سے سیراب کیا جا سکے!

اس طرح جماعت کی یہ زبردست "قوتِ تسخیر" بھی زنگ آلود ہو چکی ہے۔

تعلیمی کوششوں کے میدان میں سب سے پہلے راولپنڈی کی درس گاہ والی سکیم ناکام ہوئی۔ پھر ایک عرصہ تک اس سلسلے میں ضرورت محسوس کی جاتی رہی لیکن ہو کچھ نہ سکا۔ قرار دادِ مقاصد کے بعد اطمینان کا جو سانس لینا نصیب ہوا تھا اس میں چند مدارس کی ابتدا کی گئی لیکن اس میں بھی کسی نئی تعلیمی پالیسی کا اجراء نہ ہوا بلکہ بس "ضرورت کے احساس" کو مطمئن کر لیا گیا۔ اب ایک عربی مدرسے کی ابتدا حیدر آباد سندھ کے پاس ہوئی ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ تعلیمی انقلاب ہے جس کا نعرہ اس قدر زور سے بلند کیا گیا تھا۔

● دعوت، تنظیم اور اصلاح و تربیت کا کام بھی نہ صرف یہ کہ سیاسی مصروفیتوں کے باعث بالکل نہ ہو سکا، بلکہ اس سلسلے میں جماعت کے نظریات میں بھی بڑا انقلاب واقع ہوا۔

دعوت کے سلسلے میں جماعت کا سارا زور "خود کو بدلو" کے بجائے "حکومت سے مطالبہ کرو" پر رہا۔ اور پورے ۹ سال تک دعوت کا کام حقیقتاً بند رہا اور اس سے جو زبردست نقصان تحریک کو ہوا اس کے ایک پہلو پر تو سب کی نگاہ ہے کہ "ہمارا کام نہ ہوا۔" لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں کی نگاہ ہے کہ "دوسرے کام کر گئے"!----اس پورے عرصے میں جب کہ جماعت دستورِ اسلامی کی مہم چلاتی رہی ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے میں "تجدد پسندوں" کے افکار اور خیالات تیزی کے ساتھ پھیلے----اور دوسری طرف پرانے دینی طبقوں کو جن سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوگ جماعت میں شامل ہو رہے تھے، اپنے تحفظ کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے اپنے حلقوں کے گرد ایسا حصار کھینچ لیا کہ اب اگر جماعت کوشش کرے تب بھی اپنے افکار و خیالات کو آسانی کے ساتھ اس حلقے میں نہیں پھیلا سکتی! چنانچہ آج جماعت دونوں اطراف سے "اچھوت"

بنا کر رکھ دی گئی ہے۔ قدامت پسند گروہ میں وہ تجدد پسند مشہور ہے ---- اور تجدد پسند گروہ اسے قدامت پسندی کے طعنوں سے نوازتا ہے اور جماعت ہے کہ دونوں کے درمیان بالکل Isolate ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی بات نہ وہ سنتے ہیں کہ جن پر جدید رنگ غالب ہے اور نہ وہ سنتے ہیں کہ جن پر قدیم رنگ پختہ ہے۔ ایک بہت ہی پتلی سی تنگنائے ہے جو "کچھ اِدھر کے اور کچھ اُدھر کے" اور زیادہ صحیح الفاظ میں "نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے" لوگوں پر مشتمل ہے کہ جن میں جماعت کے افکار و نظریات کے بآسانی پھیلنے کے مواقع باقی رہ گئے ہیں ---- اس بات کا اصل اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ جماعت پھر اپنی دعوت لے کر میدان میں نکلے اور دونوں طبقات سے مخاطب ہو۔ اس وقت اندازہ ہو گا کہ یہ مورچے اب مضبوط دفاعی انتظامات کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

اصلاح و تربیت کا بھی عملی کام تو کوئی نہ ہو سکا' البتہ ایک دو بار جو کوششیں ہوئیں ان کا یہ پہلو لائق توجہ ہے کہ ان میں جماعت نے اپنے اس مخصوص طریق کار کو چھوڑ کر جو اس نے دورِ اول میں اختیار کیا تھا ان سطحی طریقوں کو آزمایا---یا آزمانے کی کوشش کی جن سے کسی حقیقی اور مستحکم اصلاح کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہو گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہاں کے معاشرے کے بارے میں جماعت اسلامی کی رائے اب یہ ہو گئی تھی کہ اس کی اصلاح کے لیے "انجمن تحفظِ اخلاقِ عامہ" کی قسم کی کوششیں کار آمد ثابت ہو سکیں گی اور "اصلاحِ معاشرہ" کی مہم سے یہ توقعات وابستہ کی گئیں کہ ان سے معاشرہ میں اخلاقی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

پھر تعجب پر مزید تعجب اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ خیال اناڑیوں کا نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کی طرف سے پیش ہوا کہ جو اس سے قبل (دورِ اول میں) معاشرے کا صحیح تجزیہ کر کے صحیح نہج کار اختیار کر چکے تھے۔

● اس دورِ ثانی میں سیاسی مصروفیات کے علاوہ اگر کسی کام پر فی الواقع توجہات اور سعی و جہد مرکوز ہوئی ہیں تو وہ خدمتِ خلق کا کام ہے۔ اس کام کے لیے وقت اور

ذرائع اس لیے نکل آئے کہ وہ دراصل سیاسی کام ہی کا ایک ضمیمہ تھا اور اس سے اصل مقصود سیاسی اغراض تھیں اور یہ بات کہ دستوری جدّوجہد کے زمانے میں جب کہ علمی اور تعلیمی کام یک قلم موقوف ہو گئے اور دعوت و تربیت کے لیے وقت قطعاً نہ مل سکا' اس کام کے لیے وافر وقت اور وافر قوت نکالی گئی' اس بات کا بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اس سے اصل مقصود رضائے الٰہی کا حصول اور اس کا اصل محرک خدمتِ خلق کا جذبہ نہیں بلکہ مقصودِ اصلی ارزاں شہرت اور محرکِ اصلی اس کی طلب تھی!

یہی وجہ ہے کہ شعبۂ خدمتِ خلق کے کام میں اصل توجہ کام کے معیار پر صرف نہ کی گئی بلکہ اس کی مقدار کو بڑھانے کی دُھن سوار رہی۔ جہاں دو چار کرسیاں اور میزیں اور ایک طبیب نما ڈاکٹر یا ڈاکٹر نما طبیب مل گیا شفاخانہ کھول دیا گیا۔ مجھے حقیقتاً جماعت کے اکثر شفاخانوں کو دیکھ کر صدمہ ہوا ہے کہ جس کام کا شہرہ اتنا اور غلغلہ اس قدر ہے اس کی حقیقت یہ ہے! آپ نے ایلوپیتھی اور طب کی ملی جلی ڈسپنسریاں قائم کر کے ان لوگوں کو ان میں لوگوں کی موت و زندگی سے کھیلنے کے لیے لا بٹھایا کہ جو نہ طبیب تھے نہ ڈاکٹر! صرف اس لیے کہ پبلک کے سامنے یہ کارنامہ تو لایا جا سکے کہ ہم نے ایک "شفاخانہ" قائم کر دیا ہے۔ ع

"ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دِل کی خاطر!"

اس "شعبۂ خدمتِ خلق" نے جہاں اور بہت سے نقصانات جماعت اور اس کے کام کو پہنچائے ہیں وہاں اسی کی وجہ سے ایک بہت بڑی پیچیدگی علماء کے اس طبقے کا جماعت سے خبردار اور ہوشیار ہو جانا تھا جن سے زکوٰۃ و صدقات اور چرمہائے قربانی و عقیقہ چھین کر جماعت نے ان کے معاشی وسائل میں دست اندازی کی تھی۔ یہاں سوال صرف علماء کے ایک طبقے کی معاش ہی کا نہیں اس پورے قدیم نظامِ تعلیم کا بھی تھا جس کے Finance کا سب سے بڑا ذریعہ زکوٰۃ و صدقات ہی کی رقوم تھیں۔

چنانچہ "تملیکِ زکوٰۃ" کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سلسلے میں جماعت

اسلامی کی سب سے بڑی اہل علم اور اہل قلم ہستی نے "علمی بزدلی" کا بیّن ثبوت فراہم کیا۔ اول اول جب یہ مسئلہ چھڑا تو جواب دینے کے لیے میدان میں مولانا مودودی صاحب تشریف لائے اور ایچ پیچ کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی۔ آپ نے ایک طرف "لامِ تملیک" کو اصولاً تسلیم کر لیا (اس لیے کہ یہ اس ملک کی واضح اکثریت کی فقہ کا متفقہ اصول تھا) لیکن ایک لمبے اور پیچیدہ استدلال سے اس کی ایسی توجیہ کی کہ جس سے اس کی عملی قید و پابندی ختم ہو جائے۔ علماء کرام میں سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ایک مدلّل جواب دیا اور مولانا کے استدلال کی کمزوری کو واضح کر دیا۔ اب صحیح طریقہ یہ تھا کہ مولانا خود ہی سامنے آتے اور یا تو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے یا پھر لامِ تملیک کا انکار کر کے نیا استدلال قائم کرتے۔ لیکن اس موقع پر انہوں نے مولانا اصلاحی صاحب کو جواب کے لیے آگے لا کھڑا کیا اور انہوں نے لامِ تملیک ہی سے انکار کر کے اس مخمصے کو ختم کیا جس میں مولانا مودودی صاحب پھنس گئے تھے!

لیکن اس طرح یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ بس جماعت اسلامی کے متعلقین کے لیے حل ہوا تھا۔ اس سے عوام کی تسکین اور اطمینان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ ایک کراچی کو چھوڑ کر باقی تمام جگہوں پر محسوس کیا گیا کہ اب یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکے گا "تو پھر اب یہ خیال پھیل رہا ہے اور اسی کی طرف جماعت کی مرکزی پالیسی جا رہی ہے کہ شفاخانوں کو کم کیا جائے یا کم از کم اور نہ کھولے جائیں۔ جو ہیں ان کو "مفت" سے آہستہ آہستہ "سستا" بنا دیا جائے اور زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سے عربی مدارس کھولے جائیں۔ ع لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

حلقۂ متفقین

اس دورِ ثانی میں ایک اور نمایاں بات کہ جو دورِ اول سے بالکل متضاد نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اب جماعت کا سارا زور رکنیت سازی سے ہٹ کر "متفقین سازی" پر ہو گیا ہے۔ یہ بھی دوسری تمام چیزوں کی طرح اس طریق کار کا ایک فطری تقاضا تھا کہ جو

۷ ۴۷ء میں اختیار کیا گیا۔

اس سے قبل رکنیتِ جماعت پر جو زور دیا جاتا تھا اور ہمدردوں سے جس طرح تخاطب کیا جاتا تھا وہ اسی تحریر کے صفحات ۱۰۰'۱۰۱ پر ایک مرتبہ پھر نظر دوڑا کر ذہن میں مستحضر کر لیجئے۔ اور اب دورِ ثانی میں جو طریق اختیار کیا گیا اس کو دیکھئے تو کم از کم زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ وہی مولانا امین احسن اصلاحی جن کی تقریر کا اقتباس وہاں درج کیا گیا ہے' ۵۵ء کی ابتدا میں منٹگمری کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جماعت اسلامی کی رکنیت کا معاملہ بڑے "کھکھیڑ" کا معاملہ ہے۔ اگر آپ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کر سکیں تو حلقہ متفقین میں شامل ہو جایئے۔"
> (روایت بالمعنیٰ)

گویا کہ اب جماعت کی رکنیت لازمی نہیں رہی.... اس کے لیے "کھکھیڑ" مول لینا یا نہ لینا آدمی کی مرضی پر منحصر ہے!

جماعت کی شوریٰ نے جو فیصلہ ملازمینِ سرکار کے بارے میں کیا' اس میں بھی دانستہ یا نادانستہ اس قسم کے الفاظ آ گئے تھے:

> "جماعت ان لوگوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی!"

اور یہ تو قول کا معاملہ ہے.... عمل کی بات ان سے کہیں آگے ہے' لوگوں کو باقاعدہ مشورے دیئے جاتے ہیں کہ رکنیت مت اختیار کرو بلکہ فلاں جگہ جا کر "ویسے" ہی کام کرو! اگر رکن بن جاؤ گے تو "وہاں" کام کیسے ہو گا!....

.... مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ باتیں صرف تقابل کے لیے عرض کر رہا ہوں' ورنہ مجھے ان میں سے کوئی بات بھی خلافِ توقع نظر نہیں آتی۔ ۷ ۴۷ء میں جو بیج بوئے گئے تھے یہ انہی کی فصل ہے....

نظامِ بیت المال

نظام مالیات بھی از سرتاپا تبدیل ہو چکا ہے!

دورِ ثانی کی ابتدا ہی میں جب اخراجات تیزی کے ساتھ بڑھنے شروع ہوئے تو چونکہ ارکان کی تعداد بھی بہت محدود تھی اور ان میں سے کم ہی معاشی طور پر خوشحال تھے' اس لیے روپے کی فراہمی کے لیے متفقین اور متاثرین کی طرف باقاعدہ رجوع کیا گیا اور جوں جوں "مہماتی کام" بڑھتا گیا اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے گئے "فراہمیٔ زر" بھی باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ ابتداءً تو متفقین اور متاثرین تک صرف رجوع تھا' فراہمیٔ زر کے طریق کار میں کوئی تبدیلی نہ تھی لیکن یہ طریق کار آخر کب تک ساتھ چل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ طریق بھی بدل دیا گیا۔ باقاعدہ اپیلیں کر کے چندے جمع کیے گئے۔ ٹکٹوں کی شکل میں پیسے فراہم کیے گئے۔ لوگوں کے مکانوں اور دکانوں پر حاضر ہو ہو کر "اعانت" طلب کی گئی اور رفتہ رفتہ وہ سارا وقار خاک میں ملا دیا گیا کہ جو دورِ اول میں جماعت کے مخصوص طریق کار سے پیدا ہوا تھا۔

اور اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ایک باقاعدہ طبقہ ایسے "ہمدردوں"[۳۲] کا بن چکا ہے کہ جن سے جماعت کی اپیل ہے ہی صرف یہ کہ "پیسے دو!" ---- نہ یہ دعوت ہے کہ خود کو بدلو ---- ! نہ یہ ترغیب ہے کہ جماعت کے رکن بنو ---- دعوت ہے تو ایک اور ترغیب ہے تو بس یہ کہ پیسے دیتے جاؤ! ---- اسے دانستہ نہ سہی نادانستہ کہہ لیجیے' بہرحال ایسا ایک طبقہ پیدا کیا گیا ہے اور اسے برقرار رکھا جا رہا ہے ---- !! ---- اس لیے کہ اس کے بغیر مالی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں!

دوسری طرف اراکین کے اپنے مالی ایثار میں بے حد کمی واقع ہو چکی ہے! اور تیسری طرف خرچ میں اب وہ احتیاط اور بیت المال کے بارے میں اب وہ احساسِ ذمہ داری بھی باقی نہیں رہا کہ جو دورِ اول میں تھا (اس کی صرف یہ دلیل کافی ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اس پر اپنی دوسری اسیری سے رہائی کے بعد ایک باقاعدہ سرکلر جاری کیا ---- !)

---

[۳۲] بلکہ صحیح تر الفاظ میں "سرپرستوں"

نتیجۂ کلام

جماعت کے دورِ ثانی کے بنیادی نظریات---- اس کے طریق کار' جدّوجہد کے مراحل اور اس کے نتائج و ماحصل---- اور اس کی خامیوں اور خرابیوں کا یہ جائزہ قدرے طویل ہو گیا ہے' لیکن میں چاہتا تھا کہ پوری تفصیل کے ساتھ بتادوں کہ اس دَور کے آغاز میں طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی تھی اس نے کس طرح اس کے ایک ایک گوشے کو اس قدر متأثر کیا کہ اس کی کیفیت سابق سے بالکل مختلف بلکہ اس کے بالکل برعکس ہو گئی۔

اس جائزے کے دوران جن آراء کا میں نے اظہار کیا ہے اور جس نقطۂ نظر کو میں نے بیان کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کہیں کہیں جُزءً تو اس سے اختلاف ممکن ہے لیکن مجموعی طور پر اس سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ جماعت کی قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم کی پوری داستان اس طرح سامنے رکھ دی گئی ہے کہ اس کے ان دو ادوار کے نقوش بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ دورِ اول کے نقوش صفحہ قرطاس پر ثبت کرنے کے بعد میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک اسلامی تحریک کے نقش و نگار ہیں---- لیکن اس دورِ ثانی کے نقوش کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اس میں "ایک اصولی اسلامی جماعت" کی خصوصیات کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتیں---- یہ ایک خالص بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں' جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی قوم میں برسرِ اقتدار آنے کے لیے اسلام کو بطور نعرہ (Slogan) استعمال کر رہی ہے۔

میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا کہ جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی لیکن یہ بہرحال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے! یہاں تک کہ جماعت کی پندرہ سالہ زندگی کے یہ دو ادوار کسی ایک ہی تحریک کے دو مراحل قرار نہیں دیئے جا سکتے بلکہ ان میں کا ہر مرحلہ بجائے خود ایک مستقل تحریک ہے اور یہ دونوں تحریکیں آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں اور ان میں سوائے ایک نام کے اشتراک کے اور کوئی قدرِ مشترک باقی نہیں رہی ہے۔

میری رائے میں جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اس ابتدائی تحریک کے کچھ اثرات ایک عرصے تک برسرکار رہے ہیں، لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں۔ اب اس تحریک میں سے اگر کچھ باقی ہے وہ ان چند نیک دل اور مخلص لوگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جنہیں اس اصل تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطہ میں تھامے چلے آ رہے ہیں۔ اور اب بھی اگرچہ ان کی اکثریت کچھ کھٹک محسوس کر رہی ہے لیکن سوائے چند کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے! مجھے اب مستقبل کے بارے میں بھی کوئی امید ہے تو وہ صرف ان کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں تو وہ

آگے بڑھنے کی دھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑکر صحیح راستے کو اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سرِ نو ہی شروع کرنا پڑے۔

اور اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس طرح کہ پچھلی غلطیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے۔ ایک ایک غلطی کا واضح اور شعوری اعتراف ہو اور اس کے جو جو اثرات جہاں جہاں مترتب ہوئے ہیں ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور کرید کرید کر سامنے لایا جائے---اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس طویل بیان میں کی ہے.... اور اگر یہ کوشش اس اصل تحریکِ تجدید و احیائے دین کے احیاء میں کچھ بھی مفید ثابت ہو سکے جو جماعت اسلامی کے زیر سرکردگی ۱۹۴۱ء سے ۴۷ء تک ہندوستان میں جاری رہی تھی تو میں سمجھوں گا کہ یہی میری نجات کے لیے کافی ہے..... رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ○



تبدیلی کیوں؟

- مبیّنہ وجُوہات کا جائزہ
- اصل سبب

مبیّنہ وجوہات کا جائزہ

"جماعت اسلامی، اس کی تاریخ، مقصد اور لائحہ عمل" میں مولانا مودودی صاحب نے ان دلائل کو جمع کر دیا ہے کہ جن کی بنا پر ان کی رائے میں قیام پاکستان کے وقت جماعت کے طریق کار میں تبدیلی[1] ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس پوری بحث اور اس میں اختیار کردہ استدلال کا خلاصہ حسب ذیل تین نکات ہیں:

۱۔ مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی اخلاق انتہائی دگرگوں حالت میں تھا۔ ان میں "صبر، ضبط، نظم، باقاعدگی، محنت، تعاون، مواساۃ، امانت، فرض شناسی، احساسِ ذمہ داری، حدود کی نگہداشت اور وحدت و اخوت" کے وہ اوصاف موجود نہ تھے "جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔" اول تو پہلے ہی مسلمان قوم اس

---

[1] یہاں یہ پیش نظر رہے کہ ان کی رائے میں اس تبدیلی کی نوعیت بس یہ تھی کہ :

"جماعت اسلامی پاکستان کو یک لخت توسیع اور عملی اقدام کے مرحلے میں داخل ہو جانا پڑا۔ ۱۰۱"

جبکہ میرے نزدیک طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کی تحریک کی نوعیت ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس تبدیلی کو اس قدر "بنیادی" نہ سمجھا گیا ہو بلکہ اسی قدر سمجھا گیا ہو جتنی ایک تحریک کے دو مراحل کے طریق کار میں ہوتی ہے لیکن اس نوعیت کی تبدیلی کا ثبوت خود اس تحریر میں موجود ہے :

"۔۔۔۔اس لئے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اس وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیر بھی آج تک ہم کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنا ہو گی ۔۔۔۔ اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یک لخت بااختیار ہو گئی ہے۔"

گویا اس طریق کار سے مقصود اقامت دین نہیں بلکہ مسلمان قوم کو سنبھالنا تھا۔

اعتبار سے دیوالیہ تھی اور پھر یہ کریلا اس طرح نیم چڑھا کہ: "دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے....." —— یہ پوری صورت حال ان حالات میں پوری طرح اجاگر اور نمایاں ہو گئی کہ جو تقسیم کے وقت اور اس کے مابعد پیش آئے۔

لہٰذا

ناگزیر تھا کہ اس مسلمان قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کی جاتی۔

۲—— "۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں ایک مصنوعی انقلاب تھا" -----اور "پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں----اور

"یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنا زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے!"

۳—— "خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا

ہے۔۔۔۔"

یہ تمام باتیں جو اس استدلال میں بیان ہوئی ہیں۔۔۔ سوائے ایک کے جو بظاہر کسی قدر وقیع معلوم ہوتی ہے۔۔۔ بقیہ تمام کی تمام اس قدر بودی ہیں کہ ان پر کلام کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

● پہلی بات کے سلسلے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ قوم جس حالت میں تھی آپ نے اس کا ٹھیک ہی اندازہ کیا لیکن یہ آپ کے دل میں یکایک قوم کا درد کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔ آپ تو ایک اصولی اسلامی جماعت تھے۔ ایک عمر آپ کو مسلم قوم پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی تھی اور مسلمانوں کی گزشتہ قومی جنگ میں کہیں آپ نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔۔۔۔ اور آج آپ اس قوم کے دردمند اور بہی خواہ اور "اس کو سنبھالنے" کے لیے بے چین نظر آرہے تھے۔ آپ طریق کار میں تبدیلی کا سبب اس بات کو بتا رہے ہیں۔ حالانکہ دریافت طلب معاملہ یہ ہے کہ خود آپ کے نقطۂ نظر میں یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔۔۔؟

● تیسری بات اپنی جگہ خوشنما تو بہت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے ثابت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ مان لیا کہ آپ کے ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت کی ایک آزمائش ہو گئی تھی لیکن نتیجتاً صرف یہی تو ظاہر ہوا کہ اب تک جو کچھ کام آپ نے کیا وہ صحیح نہج پر تھا اور بار آور ہوا ہے۔ آگے اطمینان سے پیش قدمی جاری رکھئے۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ آپ اپنے کام کی نوعیت ہی بدل ڈالیں۔ اگر آپ اسے تبدیلئ نوعیت نہ سمجھیں (اگرچہ فی الواقع ہے ایسا ہی) تو بھی اس امتحان کے نتیجے کو دیکھ کر آپ نے جس قدر بڑا اقدام کر دیا اس کی نوعیت ' خود آپ کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا جائے تب بھی کم از کم ایسی تھی کہ جیسے ایک بچے کا پرائمری کا امتحان لیا جائے اور وہ اس میں "کامیاب" ہو جائے تو پھر اسے فوراً کالج میں لا بٹھایا جائے۔۔۔ اور استدلال یہ کیا جائے کہ جناب یہ امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا!

دوسری بات بظاہر کافی وقیع اور وزنی ہے اور جماعت کے اندرونی حلقوں میں

اصل میں یہی ایک بات مسلسل بیان ہوتی ہے۔ اس کا جائزہ ذرا تفصیل سے لینے کی ضرورت ہے، لیکن اس سے قبل اس تحریر پر بھی نظر ڈال لیجیے جو اسی معاملے کی توضیح کے لیے "اسلامی نظام کے قیام کی صحیح ترتیب" کے عنوان سے "ترجمان القرآن" ستمبر ۴۸ء کے رسائل و مسائل میں شائع ہوئی تھی:

"واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔"[۱۳۳]

کے بعد مولانا پہلے طریقے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے پر ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں (جنہیں ہم نے اپنے "مطالبہ" میں بیان کر دیا ہے) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے.... پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی

---

[۱۳۳] اس پر اس اعتبار سے تعریض میں اس سے قبل کر چکا ہوں کہ.... کچھ ہی عرصہ قبل اسلامی حکومت کا قیام صرف ایک طریقہ پر ممکن ہوا کرتا تھا۔

طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظامِ زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔"

یہاں آپ "اسلامی دستور" اور "انقلابِ قیادت" کے لیے لازمی Prerequisites کے طور پر اس چیز کو بیان کرتے ہیں کہ برسرِاقتدار گروہ کے لوگ اتنے مخلص ہوں کہ خود محسوس کرلیں کہ اب ہمارا کام ختم ہوا اور آئندہ کے کام کے لیے ہم ناکارہ ہیں اور از خود پیچھے ہٹ کر کارآمد اور باصلاحیت لوگوں کے لیے جگہ خالی کردیں۔

اور پھر جب آپ فرماتے ہیں:

"ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں....."

تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا واقعی اس برسرِاقتدار گروہ کے بارے میں کہ جس کی شان میں ایک مسلسل قصیدہ پچھلے چار ماہ سے آپ "اشارات" میں لکھتے چلے آرہے تھے اور جس پر بعد میں مسلسل شدید تنقید ہمارے حلقوں سے ہوتی رہی.... آپ کی رائے واقعتاً یہی تھی.....اور نہیں تھی اور ہرگز نہیں تھی.....تو خود ہی سوچیے کہ اس طرح کی تحریروں سے آپ جماعت کے کارکنوں کو تو مطمئن کر کے ساتھ لے کر چل سکتے تھے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ پبلک کے ایک طبقہ کو بھی اس طرح مطمئن کیا جا سکتا تھا' لیکن کیا واقعی اپنے اصل کام میں بھی ان سے کسی طرح کا فائدہ اور امداد حاصل ہونے کی توقع تھی؟

اب اس بات کی طرف متوجہ ہوئیے کہ جسے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ یہ دلیل جو کئی دلائل کا مجموعہ ہے جماعت کے حلقوں میں بے حد عام ہے۔ اس کا ایک حصہ تو وہ ہے کہ جو عوام کے سامنے بھی آجاتا ہے اور اصل حصہ وہ ہے کہ جو خواص میں تو ہے لیکن عوام میں نہیں آتا۔ مجھے اس پورے طرزِ استدلال کو ایک موقع پر ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز کی زبان سے سننے کا موقع ایک نجی صحبت میں ملا تھا۔ بنابریں میں ان دونوں حصوں سے کسی قدر واقفیت رکھتا ہوں۔ اس دلیل کے اصل میں دو جزو ہیں:

یعنی یہ کہ اگر اس وقت یہاں ایک غیر اسلامی دستور کو نافذ ہونے دیا گیا تو ---ایک تو پھر اس دستور کو بدل کر اسلامی دستور کا نافذ کرانا لکھو کھا درجے مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے لیے خون کی ہولی کھیلنی ہو گی اور ایک طویل جدوجہد کے بعد بھی اس کے بدلے جانے کا امکان بے حد کم ہے! اور ---دوسرے اس طرح ہمارے لیے کام کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک غیر اسلامی دستور کو منظور کرنا تو بہرحال ہمارے لیے ممکن نہ ہو گا' لیکن جب ہم اسے تسلیم نہ کریں گے تو ہماری پوزیشن مملکت کے باغیوں کی سی ہو جائے گی اور ہمارا اصل مقام پھانسی کے تختے اور جیلوں کی کال کوٹھڑیاں ہوں گی ---اور یہ کام کسی طرح آگے نہ چل سکے گا-----

اس میں سے جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے' یہ تو صحیح ہے کہ واقعتاً کسی دستور کے ابتداہی میں ایک نوعیت کے بنوالینے اور اس کے کسی اور نوعیت کے بن جانے کے بعد اس کے بدلوانے کی کوشش کرنے میں خاصا فرق ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ دو باتیں اس وقت کس طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں ---- ایک یہ کہ دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی انقلابی تحریکیں بر سر کار آئی ہیں اور انہوں نے اپنا خون اور پسینہ بہا کر وقت کے نظام کو بدلنے کی سعی کی ہے' تو آج تک کبھی دستور کے کاغذی پرزے تو دور رہے' بڑے بڑے جابر اور قاہر شہنشاہوں کا جبرو قہر ----- اور بڑی بڑی مضبوط حکومتوں کی طاقت حتیٰ کہ ٹڈی دل فوجوں کی قوت بھی ان کا راستہ روک نہیں سکی ہے ----- انقلابی تحریکوں کے راستے میں حکومتیں اور ان کا جبرو تشدد رکاوٹ نہیں بن سکتے تو دستور کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انقلابی طاقتوں کے خلوص کو مصائب و مشکلات اور ابتلاو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھا ضرور جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس طویل اور جان گداز مگر صحیح اور فطری طریق کار کو چھوڑ کر آسان اور مختصر مگر غلط اور غیر مفید طریق کار کے اختیار کرنے سے یہ توقع قائم کرنا تو بہرحال صحیح نہیں ہے کہ وہ کام ہو جائے گا کہ جو پیش نظر ہے! جتنی آسانیاں آپ تلاش کریں گے اسی قدر اپنے مقصد سے دور ہوں گے اور اگر کہیں تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی بھی تو وہ

سطحی، ناپائیدار اور غیر مستحکم --- بلکہ متزلزل ہوگی --- ع

تن آسانیاں چاہیں اور آرزو بھی
یہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

پھر دوسری بات (اور اس سلسلے میں خصوصاً ملک صاحب کے پر زور استدلال) کو سن کر تو یہ خیال دل میں پیدا ہونے لگا تھا کہ آج سے سولہ سترہ سال قبل جب اس تحریک کی بنا رکھی جا رہی تھی اس وقت کے پیش کردہ خیالات واقعی ذہن میں غور و فکر کے بعد تیار ہوئے تھے یا بعض کانوں سے سنی ہوئی باتیں تھیں کہ جو زبان و قلم کی جنبش و حرکت کے ذریعے ظاہر ہو رہی تھیں --- اور اس وقت کے ظاہر کیے ہوئے جذبات واقعتاً دل میں گہری جڑیں رکھتے بھی تھے یا نہیں؟ ذرا صفحات ۸۴ - ۸۵ تحریر ہذا پر مندرج "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کا اقتباس پڑھئے اور پھر ص ۹۳ پر مندرج اقتباسات پر نگاہ ڈالئے تو اس زمانے میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کا ایک دھندلا سا تصور سامنے آتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا ناممکن ہے کہ اب جو خطرات سامنے تھے ان کا اندازہ پہلے موجود نہیں تھا اور یہ ایک بلائے ناگہانی کے طور پر نازل ہو گئے تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش آنے والا تھا اسے پہلے ہی پوری باریک بینی کے ساتھ دیکھ لیا گیا تھا اور جب یہ سب کچھ دیکھ کر اس کام کی ابتدا کی گئی اور ان تمام باتوں کے اندازے اور جو کچھ پیش آنے والا تھا اس کے صحیح تخمینے کے بعد اس تحریک کا آغاز کیا گیا تو ظاہر بات ہے کہ اسے کسی طرح صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اب جب کہ ان باتوں کے پیش آنے کا وقت آیا تو اپنا رخ ہی تبدیل کر دیا گیا[۱۵۰]

---

[۱۵۰] یہاں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ایک غیر اسلامی دستور کے نافذ ہو جانے کی شکل میں فوراً پیش آنے والی مشکلات و مصائب کا تذکرہ جس انداز سے کیا جاتا ہے وہ بھی حقیقی نہیں بلکہ مبالغے پر مبنی ہے --- ا

ایک غیر اسلامی دستور کے نفاذ کی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کون سا پہاڑ تھا جو فوراً ٹوٹ پڑنے کو تیار کھڑا تھا۔ اس صورت میں ہماری پوزیشن انگریزی دور←

میں تو اس معاملہ کو بالکل اس طرح سمجھتا ہوں کہ مشکلات' تکالیف' وقت کے نظام اور اس کی صاحب اقتدار جماعت کے ساتھ تصادم اور مصائب و آلام ہر تحریک کی راہ کے بالعموم اور تحریک اسلامی کی راہ کے بالخصوص نشاناتِ راہ اور سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم ٹھیک راہ پر چل رہے ہیں۔ یہاں جو کچھ پیش آنا چاہیے تھا وہی آرہا ہے۔ جو نشانات ملنے چاہیں تھے وہ مل رہے تھے اور بحمدِ اللہ ہم صحیح راہ کو کہیں گم نہیں کر آئے ہیں اور پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اس راہ پر سفر جاری رکھا جاتا نہ یہ کہ انہیں سامنے دیکھ کر سفر کا رخ ہی تبدیل کر دیا جاتا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک جگہ اس راہ کی مشکلات و مصائب کو "اعوان و انصار" کا درجہ دیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی راہ کے اعوان و انصار سے خوف کھا کر اس راہ ہی کو تبدیل کر دیا جائے۔

لہٰذا جہاں تک میری محدود عقل کام کرتی ہے میں تو اس دلیل کو بھی بالکل بے وزن پاتا ہوں اور اولاً ---- یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خطرات اگر حقیقی ہوتے تب بھی ان

☚ حکومت میں متحدہ جماعت اسلامی ---- اور ہندوستان میں آج کی جماعت اسلامی کی پوزیشن سے آخر کس درجہ میں مختلف ہوتی۔ آپ اس غیر اسلامی دستور کو اسی طرح قبول کرتے جس طرح انگریزی حکومت آپ کو تسلیم تھی اور ہندوستان کا سیکولر دستور جماعت اسلامی ہند نے قبول کیا ہے اور پھر اپنے اصل کام یعنی عوام میں دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تنظیم کے ذریعے انقلاب برپا کرتے تا کہ صحیح نہج پر کام آگے بڑھ سکتا۔

تصادم تو اس صورت میں بھی رونما ہوتا لیکن ذرا دیر کے بعد جبکہ آپ عوام میں کافی نفوذ کر چکے ہوتے۔ اس سے قبل تو عین ممکن تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت آپ کے ساتھ ابتداءً تعاون بھی کر لیتی (اور اس کی مثالیں ناپید نہیں ہیں) اور پھر جب تصادم ہوتا تو آپ اس طرح "ہوا" میں نہ ہوتے جس طرح آج ہیں' بلکہ عوامی طاقت آپ کی پشت پر ہوتی اور یہ منظر نہ ہوتا کہ فوجی آمریت کا خطرہ سامنے آیا اور جماعت دبک گئی۔ اور جب دستور بننے لگا تو جو کچھ ملا صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیا ---!

کے باعث طریق کار کی تبدیلی کسی طرح صحیح نہیں تھی۔۔۔ اور ثانیاً۔۔۔ خطرات جتنے کچھ بیان کیے گئے وہ سب کے سب حقیقی نہیں تھے۔ وہ پیش ضرور آتے لیکن ایک عرصہ کے بعد۔ اس وقت تو وہ اصل میں ایک وہم اور زیادہ تر شیطان کا ایک ڈراوا تھے!

اصل وجہ

سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر تمہارے خیال میں اس تبدیلی (بلکہ تمہاری رائے میں تحریک اسلامی کی "راہ راست سے انحراف") کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب میرے ذمے ہے اور اس کا وعدہ میں ص ۱۲۹ پر بھی کر آیا ہوں۔

میں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ "عجلت پسندی" ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی تفصیل بیان کر دوں۔ خصوصاً اس غرض سے کہ اس "دورِ فتن" میں جب کہ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں، کہیں مَیں بھی ان لوگوں کے زمرے میں شریک نہ سمجھا جاؤں جو محض بیانِ حال ہی پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نیتوں تک کو زیر بحث لا کر فضا کو مکدّر کر رہے ہیں۔

میری رائے میں عجلت پسندی کہنے کو تو ایسی چیز ہے کہ جس کے بارے میں معمولی استعداد اور تھوڑی سی صلاحیت رکھنے والا شخص بھی فوراً کہہ دے گا کہ یہ ایک نہایت غلط اور بڑی مہلک چیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں ایک جزِ لاینفک کے طور پر موجود ہے۔ یہ مفہوم جو میں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے قرآن مجید کا بیان کردہ ہے۔ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ"[۱۶۶] اور "وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا"[۱۶۷] کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں حقیقت کے اعتبار سے معنیٰ اور مفہوم کے دریا بند

---

[۱۶۶] سورۃ الانبیاء آیت ۳۷: "بنا ہے آدمی جلدی کا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۱۶۷] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱: "اور ہے انسان جلد باز۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گمراہی و ضلالت ' گناہ و عصیان اور ردّ و انکار کا اصل سبب "حبِّ عاجلہ" ہی ہے: "کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ" [۴۸] اور "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا" [۴۹] اور اسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات اسی مفہوم کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

لیکن اس "حبِّ عاجلہ" کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ یہ بس کفار ہی میں ہوتی ہے مومن و مسلم کے پاس بھی نہیں پھٹکتی' ایک شدید غلط فہمی ہے۔ مومن در حقیقت وہ ہوتا ہے جو شعوری طور پر دنیا پرستی (یعنی حبِّ عاجلہ) کو چھوڑ کر آخرت پرستی (یعنی حبِّ آخرۃ) کو اختیار کرتا ہے' لیکن جب تک وہ انسان ہے اور بشری کمزوریاں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں' یہ بنیادی کمزوری (عجلت پسندی) وقتاً فوقتاً اپنا مظاہرہ کراتی رہتی ہے اور انسانی قلب و دماغ کو مسحور کر کے گناہ' عصیان اور خطا کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے۔۔۔ بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر تک اس کی گرفت سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی خطا جو کچھ بھی تھی' اس کی بنیاد میں یہی عجلت پسندی کام کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی "عجلت" اگرچہ رضائے الٰہی کی طلب اور ملاقات اور کلامِ الٰہی کے اشتیاق کے غلبہ سے صادر ہوئی تھی لیکن پھر بھی یہ ان کی قوم کے مبتلائے فتنہ ہونے کا سبب بن گئی: "وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ٥ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ٥

---

[۴۸] سورۃ القیامہ آیت ۲۰ : "کوئی نہیں! پر تم چاہتے ہو جو جلد ہو اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے"۔ (ترجمہ شیخ الہند)

[۴۹] سورۃ الانسان آیت ۲۷ : "یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو"۔ (ترجمہ شیخ الہند)

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ○" [۳۹] پھر لطف یہ ہے کہ واپس تشریف لا کر اس فتنہ پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری قوم اور خاص طور پر اپنے جانشین حضرت ہارون علیہ السلام کو سرزنش کی تو اس کے یہ الفاظ بھی قرآن مجید نے نقل فرمائے ہیں: "اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ " [۴۰] خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و اُمّی کے بارے میں قرآن مجید کے اشارات و کنایات واضح دلالت کرتے ہیں کہ مختلف مواقع پر آپ ﷺ کی طبع مبارک میں بھی اس کی طرف میلان پیدا ہوا، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بروقت مامون و مصئون کیا۔

اول تو یہی "تلقیٔ وحی" میں غلبۂ شوق کی بنا عجلت اور اس کے ٹھہر ٹھہر کر آنے پر طبع مبارک کا افسردہ ہونا، جس پر پہلے دن اور رات کی آیاتِ آفاقی سے [۴۱] استشہاد فرما کر "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى " [۴۲] کی تسلی دی گئی۔ پھر کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ قرآن مجید ایک باری کیوں نازل نہیں ہو جاتا، ضمناً حضور ﷺ کو اس کی یہ حکمت بتائی گئی کہ "كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ" [۴۳]

---

[۳۹] سورۃ طٰہٰ آیات ۸۳ تا ۸۵ : "اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ؟ بولا وہ، یہ آ رہے ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی آیا تیری طرف اے رب کہ تو راضی ہو۔ فرمایا ہم نے تو بچلا دیا تیری قوم کو تیرے پیچھے، اور بہکا دیا ان کو سامری نے۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۴۰] سورۃ الاعراف آیت ۱۵۰ : "کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے؟" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۴۱] وَالضُّحٰى ○ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ○ "قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۴۲] "نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے نہ بیزار ہوا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۴۳] سورۃ الفرقان آیت ۳۲: "اسی طرح اتارا تا کہ ثابت قدم رکھیں ہم اس سے تیرا دل۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

پھر واضح طور پر بھی فرمایا گیا کہ "لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ○ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ○"...[45] اور جب اس پر بھی شوق کا غلبہ باقی رہا تو نہ صرف یہ کہ مزید واضح ہدایت کی گئی کہ "وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا"[46] بلکہ حضرت آدم کی خطاءِ اولین کا تذکرہ فرما کر ایک لطیف تنبیہ فرما دی کہ "وَ لَقَدْ عَہِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا"۔[47] ان آیات کے ضمن میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کا یہ حاشیہ لائقِ توجہ ہے:

> "جبریل جب قرآن لاتے حضرت ان کے پڑھنے کے ساتھ آپ بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاؤں۔ اس کو پہلے منع فرمایا تھا سورۃ قیامہ میں "لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ" اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ہمارے ذمہ ہے۔ لیکن بندہ بشر ہے' شاید بھول گئے ہوں' اس لیے پھر اس آیت سے تقید کیا اور بھولنے پر آگے مثل بیان فرمائی آدم کی۔"
>
> (بحوالہ حواشی کلام پاک مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی)

---

[45] سورۃ القیامہ آیات ۱۶ تا ۱۹ : "نہ چلا اس کے پڑھنے پر تو اپنی زبان تا کہ جلدی اس کو سیکھ لے۔ وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینے میں اور پڑھنا تیری زبان سے۔ پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتے کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔ پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتانا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[46] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۴ : "اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے اس کا اترنا اور کہہ اے رب زیادہ کر میری سمجھ۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[47] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۵ : "اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے' پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت"۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

پھر سورۂ عبس میں جس واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمائی گئی' اس کی بنیاد میں بھی یہی عجلت پسندی کارفرما تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس شوق کا غلبہ ہی تو تھا کہ دعوتِ حق جلد پھیلے اور لوگ جلد از جلد دائرۂ ایمان میں داخل ہوں جو اس کا سبب بنا کہ جس وقت رؤسائے قریش اور اکابرِ قوم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے' آپ ﷺ نے نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی جانب التفات نہ فرمایا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کا گمان تھا کہ یہ لوگ جو قوم میں از خود راہنمائی کے مقام پر فائز ہیں ایمان لے آئیں تو ان کی پیروی میں پوری قوم ایمان قبول کر لے گی۔ سورۂ کہف میں پھر ایک بار اسی موضوع پر مفصل ہدایات دی گئیں اور اس خیال پر کہ ان اہلِ ثروت و وجاہت لوگوں کے ایمان لانے سے دعوتِ حق کے جلد اور بسرعت و عجلت پھیلنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے' قدرے سخت الفاظ میں گرفت فرمائی گئی:

"وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○"[۴۸]

دعوتِ حق کے دوران ایک غلطی جس کا امکان اسی عجلت پسندی کی سحر

---

[۴۸] سورۂ کہف آیات ۲۷'۲۸ : "اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں اور نہ کہیں پائے گا تو اس کے سوا چھپنے کی جگہ۔ اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام۔ طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دوڑیں تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق زندگانی دنیا کی اور نہ کہا مان اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے' اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

طرازیوں سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ بسااوقات داعی اس طرز پر سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ لوگ پورے کے پورے دین اور ساری کی ساری شریعت کو من و عن قبول نہیں کرتے تو فی الحال ان سے کسی قدر کم پر معاملہ کر لیا جائے تاکہ دعوت کے پھیلنے کے راستے جو اس وقت بالکل مسدود نظر آ رہے ہیں ایک بار کھل تو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں کو پورے کے پورے حق کے قبول کرنے پر آمادہ کر لیا جائے گا۔ اس طرح اس معاملہ میں عجلت مداہنت کو جنم دیتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کو دعوت کے بالکل ابتدائی مرحلے میں اس خطرے سے خبردار فرما دیا گیا کہ "فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ" [۲۸] اور پھر مختلف مراحل میں جب دعوتِ حق کی جلد اشاعت اور دین حق کے جلد برپا ہونے کی تمنا نے، جو خالصتاً ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی پر مبنی تھی، اس صلح جوئی اور مداہنت کی جانب مائل ہونے کا امکان پیدا کیا، وحی الٰہی بروقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی فرماتی رہی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں کس قدر وضاحت کے ساتھ متنبہ فرمایا گیا:

"وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ○ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ○ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ○" [۲۹]

---

[۲۸] سورۃ القلم آیات ۸، ۹ : "سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا۔ وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔" (ترجمہ شیخ الہند)

[۲۹] سورۃ بنی اسرائیل آیات ۷۳ تا ۷۵ : "اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف تاکہ جھوٹ بنا لائے تو ہم پر وحی کے سوا، اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا۔ تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دُونا مزا زندگی میں اور دُونا مرنے میں، پھر نہ پاتا تو اپنے واسطے ہم پر مدد کرنے والا۔" (ترجمہ شیخ الہند)

اور پھر ہجرت کے بعد جب بنی اسرائیل سے سابقہ پیش آیا اور انہوں نے بھی پورے حق کے قبول کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا تو پھر حضورؐ کو متنبہ فرمادیا گیا کہ: "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ"۔ [۵۱]

ان تمام خطرات وخدشات اور بشری تقاضوں سے پیدا ہونے والی عجلت پسندی پر بروقت متنبہ کرنے کے ساتھ مسلسل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کی جاتی رہی۔ اکثر وبیشتر مکی سورتوں کا اختتام اسی صبر واستقامت کی تاکید پر ہوتا ہے۔ سورۂ مدثر کی انتہائی جامع ہدایت "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" [۵۲] کے بعد سورۂ مزمل میں "وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ" [۵۳] سورۃ الانسان میں "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ" [۵۴] سورۃ القلم میں "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ" [۵۵] اور سورۂ معارج میں "فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا" [۵۶] کی بار بار تاکید--- اور پھر ہر مرحلے پر اسی کی نصیحت کہ "وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ" [۵۷] اور "فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ" [۵۸] اور

---

[۵۱] سورۃ البقرہ آیت ۱۲۰ : "اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۵۲] "اور اپنے رب سے امید رکھ"

[۵۳] "اور سہتا رہ جو کچھ کہتے ہیں"۔

[۵۴] سو تو انتظار کر اپنے رب کے حکم کا۔"

[۵۵] اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا۔"

[۵۶] "سو تو صبر کر بھلی طرح کا صبر کرنا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۵۷] سورۃ یونس آیت ۱۰۹ : "اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۵۸] سورۃ ہود آیت ۴۹ : "سو تو صبر کر۔ البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

"وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ" [۵۹] اور "وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا" [۶۰] کی تشفی آمیز تلقین اور "فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ" [۶۱] اور "وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ" [۶۲] کی امید افزا نصیحت اسی "عجلت پسندی" کی سحر طرازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی تو تھیں۔ اس سلسلے میں سورۂ شوریٰ کی مندرجہ ذیل آیت تو انتہائی واضح اور ہر داعیٔ حق کے لیے ایسی ابدی ہدایت کی حامل ہے کہ جن پر پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ہوئے بغیر کبھی دعوتِ حق کامیابی کے مراحل تک نہیں پہنچ سکتی۔

"فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۗ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۗ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۗ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۗ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝" [۶۳]

---

[۵۹] سورۃ النحل آیت ۱۲۷ : "اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے۔" (ترجمہ شیخ الہند)

[۶۰] سورۃ طور آیت ۴۸ : "اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا۔ تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے"۔ (ترجمہ شیخ الہند)

[۶۱] سورۃ الروم آیت ۶۰، سورۃ فاطر : "سو تو قائم رہ، بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے۔" (ترجمہ شیخ الہند)

[۶۲] سورۃ ہود آیت ۱۱۰: "اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا"۔ (ترجمہ شیخ الہند)

[۶۳] سورۃ الشوریٰ آیت ۱۵: "سو تو اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ فرمادیا ہے تجھ کو اور مت چل ان کی خواہشوں پر اور کہہ میں یقین لایا اس کتاب پر جو اتاری اللہ نے، اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا۔ ہم کو ملیں گے ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام۔ کچھ جھگڑا نہیں ہم میں اور تم میں۔ اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔" (ترجمہ شیخ الہند)

اس موضوع پر اس قدر تفصیلی گفتگو میں نے اس لیے کی ہے کہ جب میں نے تحریک جماعتِ اسلامی کے غلط رخ پر مڑ جانے اور قیام پاکستان کے بعد اصل تحریک کی بساط کو تہہ کر کے ایک سیاسی اور قومی جدّوجہد میں اپنے آپ کو جھونک دینے کی اصل وجہ عجلت پسندی بتائی ہے تو کہیں اسے ایک "گالی" سمجھ کر طبائع مکدّر نہ ہو جائیں بلکہ یہ محسوس کیا جائے کہ یہ نفسِ انسانی کی ایک بنیادی کمزوری ہے اور اس سے بڑے سے بڑے لوگ بھی بالکل بچ نہیں سکے ہیں۔ حتیٰ کہ اولوالعزم پیغمبروں کو اس سے بار بار متنبہ کیا گیا ہے اور بارہا عین وقت پر ان کی راھنمائی کی گئی ہے' مبادا اس کے پھندے میں گرفتار ہو جائیں۔ انسانوں میں اس کے سحر و افسوں سے بچنے میں مدارج کا فرق ضرور ہے لیکن اس سے بالکلیہ بچنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک انسان سے اس کی بشریت بالکل ہی سلب نہ ہو جائے اور وہ ملکوتیتِ محض ہی کا پتلا بن کر نہ رہ جائے۔

دُور کی باتیں چھوڑیئے' ابھی تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اسی برصغیر ہند و پاک میں جو دعوتِ حق اٹھی تھی' جسے آپ نے "ہندوستان کی پہلی تحریک اسلامی"[۹۹] تسلیم کیا تھا اور جس کے راہنماؤں اور کارکنوں کے خلوص' تقویٰ' للّٰہیت اور اعلاءِ کلمتہ الحق کی خاطر ایثار' قربانی اور تکالیف پر صبر نے خود آپ کے قول کے مطابق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی یاد تازہ کر دی تھی' اس کی ناکامی کے اسباب کے بارے میں خود آپ ہی نے یہ تشخیص فرمائی تھی کہ انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور ایک ایسے خطے میں کہ جہاں کے عوام کو ذہنی اور اخلاقی طور پر پوری طرح اس کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا' شریعتِ اسلامی کو نافذ کر دیا۔ نتیجتاً ایک ردِّ عمل رونما ہوا اور سارے کام پر پانی پھر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ تحریک اسلامی کے لیے ایک بظاہر آسان اور مختصر راستہ (ShortCut) دفعتاً نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس آسان اور مختصر راستے کے سامنے آنے کے دو پہلو تو میں

---

[۹۹] مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی تحریک مجاہدین پر تصنیف کا نام

بیان کر ہی چکا ہوں۔ یعنی:

- ایک یہ کہ قیادت کے میدان میں ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو اقتباس مندرجہ بر ص ۱۲۱) اور
- دوسرے یہ کہ ایک نئی مملکت بنی تھی' جس کا دستور ابھی بننا تھا اور اس کو ابتداء ہی میں صحیح بنیادوں پر بنوا لینا بعد میں اس کو بدلوا کر صحیح کرنے سے زیادہ آسان نظر آتا تھا۔

اس پر اضافہ کچھ اور امور سے ہو گیا' جن میں سے سب سے اہم یہ کہ مغربی پاکستان سے ایک بہت بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کا انخلا ہوا اور اس وسیع خطۂ ارضی میں مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔ اس سے یہ راہ اور بھی آسان نظر آنے لگی۔ اور محسوس ہوا کہ اسلام کی راہ کی ایک بہت بڑی رکاوٹ اللہ تعالیٰ نے راستے سے ہٹا دی ہے۔ اب یہاں جو لوگ ہیں ان کی واضح اکثریت بہرحال مسلمان ہے اور اس کے دل میں اسلام کی محبت کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے۔ خاص طور پر اس وقت دس پندرہ سال کی قومی تحریک نے اس محبت یا کم از کم اس محبت کے اظہار کو جلا دے دی ہے۔ لہٰذا اس وقت ان کی محبت کو خواہ وہ محض جذباتی اور سطحی ہی ہو' کام میں لا کر اس مملکت کے دستور کو صحیح بنیادوں پر اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی محبت کے بل پر اور کچھ اس بنا پر کہ قیادت میں ایک "خلا" بہرحال پیدا ہو گا' انقلابِ قیادت کا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو سکتا ہے.... لہٰذا بڑھو اور اس Short Cut سے اقتدار ہاتھ میں لے کر نیچے سے اوپر کی طرف ایک فطری طریقہ پر انقلاب لانے کا کھکھیڑ مول لینے کی بجائے اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانے کا ایک موقع جو مل رہا ہے' اس سے فائدہ اٹھا لو۔

میری حقیر رائے میں اِس وقت جماعت اسلامی کی قیادت کی ذہنی کیفیت کم و بیش اسی طرز کی تھی۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اس کے سوا کسی اور بُری نیت یا Malafidel کو بر سرِ کار نہیں پاتا۔ اسے غلطی میں ضرور سمجھتا ہوں لیکن اس غلطی کو میں جذبۂ عجلت پسندی پر محمول کرتا ہوں' کسی بری نیت یا ارادے پر مبنی نہیں

سمجھتا!

یہ غلطی جب ایک بار ہو گئی تو پھر اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس پر کچھ اپنے ضمیر کو۔۔۔ کچھ جماعت کے کارکنوں کو۔۔۔ اور کچھ عوام کو مطمئن کیا جائے۔ اس لیے کہ "غلطی" کرتے ہوئے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ "نفسِ لوّامہ" [۵۵] جس کی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اتنی حقیر اور بے بضاعت چیز نہیں ہے کہ ایسے مواقع پر خاموش رہ جائے۔ غلطی اور خطا کے مواقع پر وہ انسان کو لازماً متنبہ کرتا ہے کہ "اَیْنَ تَذْھَبُوْنَ؟" [۵۶] لیکن حبِ عاجلہ کے تحت جب انسان اس غلطی کے ارتکاب کا فیصلہ کر ہی لے تو پھر "وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ" [۵۷] کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور بڑے ہی خوشنما اور جاذبِ نظر دلائل و براہین کا ایک انبار ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے تیار ہو جاتا ہے اور بعینہٖ یہی ہوا۔ دلائل تیار ہوئے' ان کے ذریعے پہلے اپنے آپ کو مطمئن کیا گیا' پھر آس پاس کے لوگوں کو اطمینان دلایا گیا اور آخر کار پبلک میں انہی دلائل و شواہد کی بنا پر اپنا مقدمہ پیش کر دیا گیا۔

اور جب ایک مرتبہ انسان غلط راہ پر جا پڑے تو یہ ایک دلخراش مگر زندہ حقیقت ہے کہ پھر رفتہ رفتہ انسان کی اپنی فکر و نظر کے زاویے اور سانچے اسی رخ پر ڈھل جاتے ہیں۔ سوچنے کا معیار بدل جاتا ہے اور غور و فکر کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک قدم دوسرے اقدام کے لیے وجہ جواز فراہم کرتا ہے۔ ایک غلطی منطقی طور پر دوسری بے شمار غلطیوں کے لیے دروازے کھولتی ہے اور استدلال کی ایک غلط کڑی آگے کی ساری کڑیوں کو غلط بنا کر رکھ دیتی ہے۔

---

[۵۵] سورۃ القیامہ: لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے برائی پر۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۵۶] تم کدھر جا رہے ہو؟"

[۵۷] سورۃ القیامہ: "اور پڑا ڈالے اپنے بہانے۔"

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

اس کے بعد اگر کبھی کھٹک محسوس ہوتی بھی ہے تو وہ اس طرح دفع کی جاتی ہے کہ کیا کریں، اب چونکہ یہ اقدام کیا جا چکا ہے، لہٰذا یہ کرنا بھی ناگزیر ہے اور ایک مجبورانہ احساس کے ساتھ انسان اس راہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں غلط رخ پر سفر جاری رہتا ہے، اسی پر انشراحِ صدر بھی ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ع

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

جو باتیں پہلے بالکل غلط تھیں، اب درست ہو جاتی ہیں۔ جو ناممکن تھیں، اب ممکن سمجھی جاتی ہیں اور آخر کار انسان اپنی تباہی و ہلاکت کا سارا سامان خود فراہم کر کے بھی اس امید پر بیٹھا ہوتا ہے کہ کامیابی قریب آرہی ہے اور منزل مقصود اب قدم بوسی کیا چاہتی ہے۔

مجھے تو "فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى" [۹۸] ..... کی بھی یہی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

- اور میری رائے میں یہی جماعت اسلامی کے ساتھ ہوا۔
- یہی اب ہو رہا ہے۔

اور

- آئندہ بھی اگر ایک جرأتِ رندانہ کے ساتھ ماضی و حال کا بے لاگ تجزیہ نہ کیا گیا اور پوری ہمت، عزیمت، دلیری --- لومۃ لائم سے بے خوفی اور استہزا اور تمسخر سے بے پروائی ---- اور فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ [۹۹] ---- سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ

---

[۹۸] سورۃ اللیل آیت ۱۰: "سو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[۹۹] سورۃ الذاریات آیت ۵۰: "سو بھاگو اللہ کی طرف۔"

مِّنْ رَّبِّکُمْ ؎ ------اور یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؎ کی شان کے ساتھ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی گئی تو------چاہے ہم اسے کتنا ہی مبغوض جانیں' اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت بہرحال پوری ہو کر رہے گی!------

خاتمہ

ابھی اس تحریر کا مثبت پہلو باقی ہے یعنی یہ کہ اب کیا اور کس طرح کیا جانا چاہیے۔ لیکن میں اس وقت اس کے بیان میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا! اس لیے کہ اس کا فائدہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور موقف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ جو میں نے پیش کیا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر اول تو میرے بیان کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جماعت کے اکابرین اس نقطۂ نظر سے خود ہی غور و فکر کریں تو ان کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل کے لیے لائحہ عمل تجویز کرنے کی صلاحیت مجھ سے تو بلا مبالغہ لاکھوں درجہ زیادہ دی ہے' لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کر دوں گا۔

......ویسے بھی یہ کسی ایک فرد یا چند افراد کے سوچ بچار کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس پر تو جماعت کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور غور و فکر کرنا ہو گا۔ تلافی مافات افراد کے لیے ہی آسان نہیں ہوتی' یہ تو ایک تحریک کا معاملہ ہے! آئندہ کے لیے میری نگاہ میں تو کوئی روشن امکان ہے تو محض اس صورت میں کہ جماعت کے تمام اصحابِ فکر ماضی کی غلطی کے شعوری اعتراف کے بعد آئندہ کے لیے لائحہ عمل تجویز کرنے کی متفقہ کوشش کریں۔ فقط۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔

خاکسار اسرار احمد

؎ سورۃ الحدید آیت ۲۱: "دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف۔"

؎ سورۃ التحریم آیت ۸: "اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ۔"

ضمیمہ

تین قراردادیں

—— (۱) ——

راقم الحروف کی قرارداد جو اجتماعِ ارکان ماچھی گوٹھ میں پیش کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں تجویز کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان حسب ذیل قرارداد پاس کرے:

"جماعت اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان بہت سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۴۷ء میں پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کے لیے جو طریق کار جماعت نے اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریق کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ یہ طریق کار اپنے سابقہ طرز عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسر اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیتہً درست ثابت نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدوجہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدوجہد کے

مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور متزلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلہ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس عرصے میں نہ تو عوام کی اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری و ذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی' اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدوجہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص و للّٰہیت کے ایک حصے کا ضیاع برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی' اصولی' اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑی ہے۔

موجودہ طریق کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماع ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدوجہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آ سکتے ہیں وہ ان تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریق کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آ سکتے ہیں۔

بنابریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریق کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریق کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دارومدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ لائحہ عمل تجویز کرنے کے لیے جماعت کے اربابِ حل و عقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں۔"

اسرار احمد عفی عنہ رکن منٹگمری

— (۲) —

مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ نومبر دسمبر ۱۹۵۶ء کی قرارداد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان دو ہفتوں کے مسلسل غور و خوض کے بعد ان تمام مسائل و معاملات کے متعلق جو جماعت کے پچھلے کام، آئندہ لائحہ عمل اور عام حالات کے بارے میں جائزہ کمیٹی رپورٹ کے ذریعے سے زیر بحث آئے تھے، حسب ذیل نتائج پر پہنچی ہے:

۱۔ جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا گیا ہے اس کے متعلق مجلس شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے۔ البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں، جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ مجلس شوریٰ کی رائے میں جو لائحہ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جو اب تک جماعت اسلامی کا لائحہ عمل ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے، اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ لیکن مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستورِ اسلامی کی پیہم جدّوجہد کی وجہ سے لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لیے خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجّہ اور کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے

اور اس بنا پر سردست کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ اسلامی اقتدار کے قیام و بقا اور دستورِ اسلامی کے تحفظ' اصلاح اور نفاذ کے لیے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ مجلس کی رائے میں نظامِ جماعت کے اندر اصل حجت کتاب و سنّت ہے اور اس کے بعد آئینی سند ہونے کی حیثیت جماعتی لٹریچر کی عبارات کو نہیں بلکہ دستورِ جماعت اور ان جماعتی فیصلوں کو حاصل ہے جو دستور کے مطابق جماعت کے مجاز اداروں (امارت' مجلس شوریٰ اور ارکان کے اجتماع عام) نے کیے ہوں۔ البتہ لٹریچر ایک مستقل ذریعۂ دعوت ہے اور رہے گا۔ اگر جماعتی فیصلوں میں کوئی چیز لٹریچر کے کسی مضمون سے مختلف پائی جائے تو وہ یا تو اس مضمون کی ناسخ ہوگی' یا اس مضمون کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو جماعتی فیصلوں کے مطابق ہوں۔

۴۔ جائزہ کمیٹی کے ذریعے سے جماعت کے جو اصلاح طلب حالات و معاملات مجلس کے سامنے آئے ہیں ان کے حقیقی اسباب متعین کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر تجویز کرنے کا کام ایک مجلس کے سپرد کردیا گیا ہے جو امیر جماعت' مولانا امین احسن صاحب' چودھری غلام محمد صاحب اور نعیم صدیقی صاحب پر مشتمل ہوگی۔ علاوہ بریں جائزے کے دوران میں جن متعین واقعات کی نشاندہی مختلف مقامات پر جائزہ کمیٹی کے سامنے کی گئی ہے' ان کی تحقیقات اور اصلاح کے لیے مجلس شوریٰ نے مناسب طریقہ تجویز کردیا ہے' جس کے مطابق حتی الامکان جلدی کارروائی کی جائے گی۔

—— (۳) ——

اجتماعِ ارکان ماچھی گوٹھ میں پاس شدہ قرارداد

جماعت اسلامی پاکستان اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتی ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جس نصب العین کو سامنے رکھ کر اور جن اصولوں کی پابندی کا عہد کر کے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا' آج تک وہ اسی منزل مقصود کی طرف انہی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے دوران میں اگر اس سے اقامتِ دین کے مقصد کی خدمت بن آئی ہے تو وہ سراسر اللہ کا فضل ہے' جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہے' اور اگر کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں اس سے سرزد ہوئی ہیں تو وہ اس کے اپنے ہی قصور کا نتیجہ ہیں' جن پر وہ اپنے مالک سے عفو و درگزر اور مزید ہدایت و توفیق کی دعا کرتی ہے۔

جماعت اسلامی اس بات پر مطمئن ہے کہ تحریک اسلامی کا جو لائحہ عمل نومبر ۵۱ء میں ارکان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں امیر جماعت نے مجلس شوریٰ کے مشورے سے پیش کیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصد تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور وہی آئندہ بھی اس تحریک کا لائحہ عمل رہنا چاہیے۔

اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء (یعنی تطہیرِ افکار و تعمیرِ افکار' صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت اور اجتماعی اصلاح کی سعی) تو جماعت اسلامی کی تشکیل کے پہلے ہی دن سے اس کے لائحہ عمل کے اجزاءِ لازم رہے ہیں' البتہ ان کو عمل میں لانے کی صورتیں حالت و ضروریات کے لحاظ سے اور جماعت کے وسائل و ذرائع کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اب یہ طے کرتی ہے کہ آئندہ کوئی دوسرا جماعتی فیصلہ ہونے تک ان تینوں اجزاء کو اس پروگرام کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ * شامل کیا جا رہا ہے۔ نیز جماعت کا یہ

---

* ضمیمہ کی کاپیاں امرائے اضلاع کو دے دی گئی ہیں' ان سے دیکھ لی جائیں۔

اجتماع عام مجلس شوریٰ اور تمام حلقوں، اضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس پروگرام پر اس حد تک زور دیں کے لائحہ عمل کے چوتھے جزو کے ساتھ جماعت کے کام کا ٹھیک توازن قائم ہو جائے اور قائم رہے۔

اس لائحہ عمل کا چوتھا جزو جو نظامِ حکومت کی اصلاح سے متعلق ہے، اور درحقیقت وہ بھی ابتدا ہی سے جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت نے ہمیشہ اس سوال کو زندگی کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن سوال سمجھا ہے کہ معاملاتِ زندگی کی زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں ہے یا فاسقین کے ہاتھ میں، اور حیاتِ دنیا میں امامت و راہنمائی کا مقام خدا کے مطیع فرمان بندوں کو حاصل ہے یا اس کی اطاعت سے آزاد رہنے والوں کو۔ جماعت کا نقطۂ نظر ابتدا سے یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اقتدار کی کنجیوں پر دین کا تسلط قائم نہ ہو جائے اور جماعت ابتدا ہی سے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھتی ہے کہ دین کا یہ تسلط یک لخت کبھی قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غیر دینی نظام کے مقابلے میں دینی نظام چاہنے والوں کی پیہم کشمکش اور درجہ بدرجہ پیش قدمی سے ہی مکمل ہوا کرتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اس مقصد کے لیے تقسیم ہند سے پہلے اگر عملاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ مواقع کا فقدان اور ذرائع کی کمی بھی تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت کے نظام میں اس مقصد کے لیے کام کرنے میں بعض شرعی موانع تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مواقع اور ذرائع دونوں فراہم کر دیئے اور شرعی موانع کو دور کرنے کے امکانات بھی پیدا کر دیئے تو جماعت نے اپنے لائحہ عمل میں اس چوتھے جزو کو بھی، جو اس کے نصب العین کا ایک لازمی تقاضا تھا، شامل کر لیا۔ اس میدان میں دس سال کی جدوجہد کے بعد اب غیر دینی نظام کی حامی طاقتوں کے مقابلے میں دینی نظام کے حامیوں کی پیش قدمی ایک اہم مرحلے تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کے دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوائے جا چکے ہیں اور ان منوائے ہوئے اصولوں کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانے کا انحصار اب قیادت کی

تبدیلی پر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت بروئے کار لانے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس لائحہ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لیے موجبِ تقویت ہو اور جتنا کام پہلے تین اجزاء میں ہوتا جائے اس نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا۔[۱۲]

علاوہ بریں چونکہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رُو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے اور پاکستان میں اس اصلاح و انقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے اور وہ ہے انتخابات کا راستہ اس لیے جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہرحال نہیں رہ سکتی خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ۔ رہا یہ امر کہ انتخابات میں کس وقت کس طرح حصہ لیا جائے اس کو جماعت اپنی مجلس شوریٰ پر چھوڑتی ہے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔



---

[۱۲] یاد رہے کہ یہ خط کشیدہ الفاظ شوریٰ کی قرارداد میں نہیں ہیں بلکہ عین اجتماع عام میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تقریر کا توڑ کرنے کے لئے مولانا مودودی صاحب نے قرارداد میں ان الفاظ کا اضافہ فرمایا تھا۔



تنظیم اسلامی

نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے

نہ معروف معنی میں کوئی سیاسی جماعت

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو سب سے پہلے پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

اسلام کے عادلانہ نظام یعنی نظام خلافت کو

قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے

امیر: حافظ عاکف سعید